ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مشاورتی بورڈ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں — پروفیسر محمد مجیب

ڈاکٹر سید عابد حسین — پروفیسر سعید انصاری

معتمد اور مدیر:- پروفیسر محمد عاقل

ادارۂ اجتماعیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد

۱- سیاسی، معاشی، تعلیمی اور تمدنی مسائل کا مطالعہ کرنا۔

۲- مطالعہ کے نتائج کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں شائع کرنا

۳- ادارہ کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالنا۔

۴- جلسے منعقد کرنا جن میں ملک کے سربرآوردہ ماہرین، ادارہ کی دعوت پر اجتماعی مباحث پر مقالوں کے ذریعے سے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے اور حاضرین سوالوں یا تقریر کے ذریعے سے تبادلۂ خیالات کرسکیں گے۔

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۲	فروری ۱۹۳۹ء	جلد ۳۱

فہرست مضامین

سائنس کی تعلیم

(از ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب صدیقی۔ ایم اے (کینٹب) پی ایچ ڈی (لیپزگ) پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

اس مختصر مضمون میں کوشش کی جائے گی کہ سائنس کی جو تعلیم ہندوستان میں دی جاتی ہے اس پر تنقیدی نظر ڈال کر معلوم کیا جائے کہ اس تعلیم میں کیا نقائص ہیں اور انھیں کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

اکثر علوم اور خصوصاً سائنس میں جو ترقی گذشتہ ایک سو سال کے دوران میں ہوئی ہے اس کے تفصیلی ذکر کی ضرورت نہیں۔ اس امر سے ہر تعلیم یافتہ شخص کم و بیش واقف ہے کہ علوم و فنون کے عمارتوں کی جو بنیادیں بابلی، مصری، چینی، ہندوستانی، اور عرب قوموں نے ڈالی تھیں وہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ بلند ہوتی چلی گئیں اور اب آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ لیکن اس سے بہت کم لوگوں کو واقفیت ہے کہ ان سر بفلک عمارتوں کی بنیادیں اس قدر کمزور تھیں کہ اگر بر وقت ان کو مستحکم نہ کیا جاتا تو شاید اب ان عمارتوں کا نشان بھی نظر نہ آتا۔ سائنس کی بنیادوں کے متعلق اس تحقیق و تجسس کا نتیجہ ہے کہ ان کے بنیادی اصولوں میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ جو نتیجے پہلے بدیہی تھے اب ان کے ثبوت کی تلاش ہے۔ جو تعریفیں پہلے کافی سمجھی جاتی تھیں اب وہ مہمل قرار دی جاتی ہیں۔ جو مسئلے کسی زمانے میں انتہائی اہمیت رکھتے تھے وہ اب کہیں گوشہ گمنامی میں پڑے ہیں۔ ریاضیات میں کبھی ضابطوں اور ان کے استعمال پر زور دیا جاتا تھا۔ اب ان کو یاد رکھنے کی کوئی فکر نہیں کرتا بلکہ طریقہ استدلال کی توجہ مرکوز رہتی ہے۔ طبیعیات میں پہلے "خواص مادہ" کے مضمون کی بہت اہمیت تھی اور اب جوہری طبیعیات کا موضوع اہم ترین سمجھا جاتا ہے۔ علم کیمیا کا مرکز ثقل غیر نامیاتی کیمیا سے ہٹ کر نامیاتی اور طبیعی کیمیا کی طرف آ گیا ہے باقی دوسرے علوم کا بھی یہی حال ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں آپ ہماری درس گاہوں کو ملاحظہ فرمائیے۔ اکثر طلبا کو مدرسہ اور کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی اپنے مضمون کے بنیادی اصولوں سے کما حقہٗ واقفیت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ خود نفس مضمون کے متعلق ان کی معلومات وہیں ختم ہو جاتی ہیں جہاں سے نیا دور شروع ہوتا ہے۔ گذشتہ سو سال کے دوران میں

جو ترقی ہوئی ہے اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے۔ اور اگر انھوں نے کبھی کسی عام فہم کتاب کو پڑھا ہے کوئی پبلک لکچر سنا ہے تو زیادہ سے زیادہ چند نئے ناموں سے واقف ہو جاتے ہیں اور انھیں اصطلاحوں کے بل بوتے پر اپنے دوست احباب پر رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان نئے اصطلاحوں کے تشریح اور ثبوت سے قطع نظر اگر ان کی تعریف ہی پوچھئے تو وہ صحیح طور پر نہیں بیان کر سکتے۔ مثلاً آج کل آپ اکثر اصحاب کی زبان پر نااقلیدسی ہندسہ، چار ابعاد، اور جوہری مرکزہ اور اسی قسم کے بیسیوں الفاظ پائیں گے حالانکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنے حضرات ان الفاظ کے حقیقی معنوں سے بھی واقف ہیں۔

اس جہالت اور ناواقفی کا ذمہ دار ہم ان بے چارے طالب علموں کو نہیں ٹھیرا سکتے جو ہندوستانی نظام تعلیم کے مشق ستم ہیں۔ زمانہ تعلیم کا اکثر و بیشتر حصہ کہنہ اور متروکہ معلومات کے بہم پہنچانے میں صرف کر دیا جاتا ہے اور جدید ترین معلومات تک پہنچنے کی کبھی نوبت نہیں آتی۔ اس کے دو بڑے وجوہات ہیں جو شاید ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ اول تو نصاب تعلیم ہی تحدید کر دی جاتی ہے کہ کسی مضمون کے متعلق فلاں چیزیں پڑھائی جائیں گی اور انھیں پر امتحان لیا جائے گا۔ نصاب بنانے والے اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جدید ترین معلومات بھی ان میں شامل کر دی جائیں تو وقت کافی نہیں ہوگا اور پھر ایسے پڑھانے والے بھی نہیں ملیں گے جو مدرسوں اور کالج کی مختلف منزلوں پر ان جدید معلومات سے بخوبی واقف ہیں۔ دوسری طرف پڑھانے اور پڑھنے والوں کو یہ فکر رہتی ہے کہ مقررہ نصاب کسی طرح ختم ہو جائے اور امتحان کے وقت زیادہ سے زیادہ تعداد میں طلبہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں۔ اس لئے نہ تو طالب علم ہی کی خواہش ہوتی ہے کہ نصاب کے باہر جدید معلومات حاصل کریں اور نہ استاد ہی انھیں ایسی ترغیب دلاتے ہیں۔ بلکہ بعض وقت تو یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اتفاق سے کسی طالب علم میں بلند پروازی کا رجحان ہو تو استاد اس کو پکڑ کر پھر اس کنج قفس میں بٹھا دیتے ہیں۔ اب چونکہ انھیں امتحانوں کے فارغ التحصیل طلبہ آگے چل کر مدرس یا لکچرار ہوتے ہیں اس لئے ان میں نئی معلومات مفقود ہوتی ہیں اور اسی فقدان کی شکایت نصاب تعلیم بنانے والے حضرات کیا کرتے ہیں۔ غرض کہ علت و معلول کا یہ دائرہ پورا ہو جاتا ہے اور یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے کہ جس کو چاہیں علت قرار دیں اور جس کو چاہیں معلول۔

سائنس کی تعلیم میں اس نقص کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ صرف قیمتی وقت بلکہ اس سے زیادہ قیمتی

دماغ مشکل اور پیچیدہ مشقوں اور سوالوں کے حل کرنے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ رجحان دوسرے علوم کی بہ نسبت علم ریاضی میں بہت زیادہ ہے، اور انگلستان کے مدرسوں اور کالجوں سے ہندوستان میں داخل ہوا ہے۔ براعظم یورپ کے دوسرے ملکوں اور امریکہ میں یہ رجحان بہت کم ہے۔ اس کے متعلق کوئی طویل بحث کرنے کی بجائے میں صرف ایک ذاتی واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کروں گا جو شاید اس بحث سے زیادہ موثر ثابت ہو۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضیات کا ٹرائی پاس ختم کرنے کے بعد میں لائپ زک یونیورسٹی میں تحقیقاتی کام کے سلسلہ میں ٹھیرا ہوا تھا۔ یہاں پروفیسر ہائی زن برگ کی وجہ سے طبیعیات کا ڈپارٹمنٹ بہت مشہور تھا اور بہت سے ممالک سے پروفیسر وغیرہ آئے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ جبکہ سیمینار کے سلسلہ میں سب لوگ جمع تھے امریکہ کے ایک پروفیسر نے مجھ سے تذکرۃً دریافت کیا کہ میں نے اس سے قبل کیا تعلیم پائی ہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں کیمبرج سے ریاضیات کا ٹرائی پاس ختم کر کے آیا ہوں تو انھوں نے بہت حیرت سے دریافت کیا کہ "کیا آپ واقعی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ٹرائی پاس کے سوالوں کو حل کرنے کے بعد بھی آپ کا دماغ صحیح و سالم ہے"۔

حاصل یہ کہ سائنس کی تعلیم میں جو وقت بے فائدہ مشقوں اور سوالات کی تعلیم میں صرف کیا جاتا ہے اس کو بنیادی اصولوں کی تشریح ان کا ایک دوسرے سے تعلق جدید سائنس میں ان کی اہمیت وغیرہ کی توضیح میں لگایا جائے تو مفید تر نتائج پیدا ہوں گے اور طلبہ میں خود غور و فکر کی عادت پیدا ہوگی۔ یہ نہیں کہ سوالات کو چند قاعدوں کی مدد سے میکانی طور پر حل کر دیں اور ان میں یہ احساس بھی نہ ہو کہ کوئی جواب فی نفسہ مہمل یا مضحکہ خیز تو نہیں ہے۔ حال ہی کا واقعہ ہے کہ ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کے امتحان میں یہ ایک سوال دیا تھا کہ اگر ایک موٹر کی قیمت بمبئی میں ساڑھے تین ہزار کل دار اور ریلوے کا کرایہ ۱۵۰ روپیہ کل دار ہو اور حیدرآباد میں ۵ روپیہ فی صدی کے حساب سے کروڑگیری ادا کرنی پڑے اور یہاں کا ایجنٹ ۲۰ فی صدی نفع لے کر فروخت کرے تو خریدار کو سکہ عثمانیہ میں کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی جب کہ شرح تبادلہ ۱۰۰ روپے کلدار کے لئے ۱۱۵ روپیہ ۱۴ آنے سکہ عثمانیہ ہو اس سوال کے جواب میں بعض امیدواروں نے لاکھوں روپیہ قیمت نکالی اور ایک برخوردار نے تو غضب کر دیا کہ دو کروڑ سے زیادہ روپیہ جواب میں حاصل کئے۔ آپ خود اندازہ فرمائیے کہ میٹرک کے طالب علم کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ایسا جواب مہمل ہے اور وہ جواب کو برقرار رکھتا ہے۔

میں نے طالب علمی کے زمانے میں کسی فارسی کتاب میں ایک مقولہ پڑھا تھا کہ اگر کسی وعظ کا اثر سامعین پر نہ ہو تو یہ سامعین کا قصور نہیں بلکہ واعظ کا قصور سمجھو کہ اس نے مضمون کو اس طرح نہیں بیان کیا جو دل نشین ہو۔ میری دانست میں یہ مقولہ حرف بہ حرف صحیح ہے اور طلبہ اور عوام الناس میں سائنس اور ریاضی کی طرف سے جو دہشت بیٹھی ہوئی ہے اس کے ذمہ دار صرف اساتذہ ہیں جو مضمون کو اس قدر خشک اور غیر دلچسپ بناتے ہیں کہ طالب علم کو خواہ مخواہ ایک قسم کی منافرت پیدا ہوتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سائنس و ریاضی کے ادق سے ادق مسائل کو بھی دلچسپ بنانا ممکن ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے خود استاد کو بھی کافی مہارت ہونی چاہیئے۔ ہندوستان کے ابتدائی مدارس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ابتدائی جماعتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرس مہیا نہیں کئے جاتے حالانکہ تعلیم کی یہی وہ منزل ہے جو سب سے زیادہ کٹھن ہے۔ میری رائے میں کوئی مدرس چاہے وہ جماعت صغیر یا اول کو پڑھاتا ہو بی اے ٹرینڈ سے کم نہیں ہونا چاہیئے مڈل اور میاٹرک کے مدرسین کم از کم ایم اے اور ایم ایس سی ہونے چاہئیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں آپ اس شرط کو نکال دے سکتے ہیں لیکن ہر علم کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا لازمی ہے۔ کسی مضمون کو وہی شخص آسان بنا سکتا ہے یا دلچسپ طریقہ پر سمجھا سکتا ہے جو اس کے ہر پہلو پر پوری طرح حاوی ہو۔ اگر آپ ایک میاٹرک کامیاب شخص کو پڑھانے بٹھائیں تو ظاہر ہے کہ وہ سوائے اس کے کہ کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس کو دہرا دے اور کیا کر سکتا ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت افسوس ہوا کہ ایک ایسے مدرسہ میں جو یورپین اداروں کی نگرانی میں ہے اور جہاں طلبہ سے تقریباً ۵۰ روپیہ ماہانہ فیس لی جاتی ہے بعض ایسے استاد سینیر کیمبرج کی جماعت کو پڑھاتے ہیں جو خود بھی صرف سینیر کیمبرج کامیاب ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جو تنخواہیں اس وقت ابتدائی جماعت کے مدرسین کو دی جاتی ہیں ان تنخواہوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرس نہیں مل سکتے۔ لوکل فنڈ کے بعض مدارس کے متعلق مجھے ذاتی علم ہے کہ استادوں کی تنخواہیں پندرہ بیس روپیوں سے زیادہ نہیں جو دوسرے محکموں میں چپراسیوں کو ملتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ معقول مشاہرے دے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ مدرسین کو ابتدائی مدارس میں بھیجا جائے جیسا کہ یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے تاکہ ہندوستان کے طلبا کی بنیادی تعلیم بھی ان غیر ممالک کے طلبہ کی طرح مستحکم ہو سکے۔ تعلیم ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو کسی قوم کو بناتا

ہے اور اس کے لئے کسی ملک کو بجٹ میں عدم گنجائش کا عذر نہیں ہونا چاہیئے۔ دوسرے شعبوں کی گنجائش سے اس کمی کو بہرحال پورا کرنا ضروری ہے۔

اب تعلیم کے مضامین پر غور کیجئے تو جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے، اعلیٰ تعلیم کے ختم ہونے پر بھی جدید معلومات تک پہونچنے کی نوبت نہیں آتی۔

غالباً ارباب تعلیم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تعلیم کی اس قلیل مدت میں جو ایم اے کامیاب کرنے پر ختم ہوتی ہے کسی سائنس کے جدید ترین اصول نہیں بتلائے جاسکتے لیکن ایک تو فرانس، جرمنی اور امریکہ کے نظام تعلیم سے اس وہم کے خلاف ثبوت فراہم کیا جاسکتا ہے۔ دوسرے خود ہر یونیورسٹی میں غور کیا جاسکتا ہے کہ میٹرکولیشن سے لے کر ایم۔ اے تک یعنی ۹ سال کے دوران میں کیا کچھ نہیں بتایا جاسکتا بشرطیکہ بہت سے فرسودہ مضامین اور لایعنی تفصیلات کو چھوڑ دیا جائے اور بے فائدہ مشقوں اور سوالوں میں وقت ضائع نہ کیا جائے علوم ریاضی اور طبیعیات کے لئے جن سے مجھے تھوڑی بہت واقفیت ہے میں نے چند دنوں قبل تفصیلی نصاب بنا کر بتلایا تھا کہ ۹ سال میں ان علوم کے جدید ترین اصول بتائے جاسکتے ہیں اور پھر طالب علم کے لئے چھوڑ دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے رجحان اور مذاق کے مطابق ان میں سے کسی ایک شاخ کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرے۔ یہ نہیں کہ ریاضیات کے ایک ایم۔ اے کامیاب طالب علم کو تفرق اور تکمل کی وہی تعریفیں معلوم ہوں جو ڈھائی سو سال قبل نیوٹن اور لائب نٹز نے کی تھیں اور یہ معلوم ہی نہ ہو کہ جدید ریاضی میں ان میں کب کا انقلاب ہوگیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے سائنسوں سے واقفیت رکھنے والے حضرات اپنے اپنے سائنس کے متعلق اسی قسم کی مثالیں پیش کرسکتے ہیں۔

اس طرح وقت ضائع کرنے کی بجائے جدید تحقیقات کے بنیادی اصول طالب علم کے سامنے تعلیم ختم کرنے سے قبل ہی پیش کردئے جائیں تو وہ نسبتاً کم عمر میں اپنے مضمون کے انتہائی مدارج سے واقف ہوکر اس عمر میں جبکہ انسان کا دماغ پوری قوت کے ساتھ کام کرتا ہے اپنی اپنی تحقیقات میں مصروف ہوجائیں گے جدید سائنس کی تاریخ شاہد ہے۔ کہ تقریباً تمام بڑے انکشافات اور اہم ترین ایجادات ابتدائی عمر میں ہی ہوتے ہیں اور تحقیقاتی کام کرنے کا بہترین زمانہ جوانی کا ہے۔ پروفیسر آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت کا انکشاف

۲۶ برس کی عمر میں کیا تھا۔ پروفیسر بوہر نے کوانٹم نظریہ کا انکشاف ۲۸ برس کی عمر اور پروفیسر ہائی زن برگ نے کوانٹم میکانکس کا انکشاف ۲۵ برس کی عمر میں کیا۔ پروفیسر لوئی ڈے بروگلی کی عمر اپنے اہم ترین انکشاف کے وقت ۳۱ برس پروفیسر شروڈنگر کی عمر ۳۹ برس اور پروفیسر ڈیراک کی عمر ۲۴ برس تھی۔ یہ سب علما اپنے مضمون کے ماہر اور نوبل انعام یافتہ ہیں۔ ان کے علاوہ گذشتہ چند سال کے دوسرے نوبل انعام یافتہ مثلاً یورے اینڈرسن، ڈی بائی وغیرہ بھی متقابلتہ کم عمر ہیں۔ یہ اسی نظام تعلیم کا نتیجہ ہے کہ جامعہ سے فارغ التحصیل ہونے سے قبل طالب علم اپنے مضمون کے جدید ترین تحقیقات سے نہ صرف واقف ہوتے ہیں بلکہ خود بھی اسی پایہ کی تحقیقات کر سکتے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہماری جامعات کے میٹرک سے لے کر۔ ایم اے تک تمام نصابوں کو بنیادی طور پر بدل دیا جائے۔ یوں تو ہر چند سال کے بعد کسی قدر تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے لیکن ایک فرسودہ مضمون کی بجائے دوسرے فرسودہ مضمون کو رکھنے سے کوئی اصولی فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔ اب محض ردوبدل کا زمانہ نہیں بلکہ ایک انقلاب کی ضرورت ہے کہ پورا نصاب تعلیم مکمل طور پر بدل دیا جائے۔ اس ضمن میں ایک غلط فہمی کو بھی رفع کر دینا ضروری ہے جو ہماری قومی زندگی پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہے۔ ایک خاص طبقہ میں آج کل جامعہ عثمانیہ کی تعلیم اور یہاں کے تعلیم یافتہ طلبا کی مذمت کرنا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ ہم ان لوگوں کے سامنے علی الاعلان کہتے ہیں کہ بے شک ہماری تعلیم میں نقائص ہیں اور ایسے نقائص ہیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں لیکن یہ نقائص صرف جامعہ عثمانیہ سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جیسا میں نے اوپر بیان کیا ہے ہندوستان اور انگلستان کی تمام یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں۔ گذشتہ سات سال کے عرصہ سے میں کلکتہ، مدراس، الہ آباد، پنجاب وغیرہ دوسری یونیورسٹیوں کا مسلسل ممتحن رہا ہوں اور ڈاکٹر آف سائنس سے لے کر ہم۔ ایس سی اور بی اے (آنرز) تک تمام ڈگریوں کے لئے امتحان لیتا ہوں۔ میں ہمارے ان کرم فرما ناقدین کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ وہ ان بیرونی جامعات کے مقابلہ میں جامعہ عثمانیہ میں کوئی غیر معمولی نقص نہیں پائیں گے جو کچھ بھی نقص ہیں وہ موجودہ نظام تعلیم اور نظام امتحان کے ساتھ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

اس نظام تعلیم کا ایک اور نقص یہ ہے کہ موہوم افادیت کے خیال سے تعلیم کے اصلی مقصد کو نظرانداز

کر دیا جاتا ہے اور ستم ظریفی یہ کہ اس قربانی کے باوجود حقیقی افادیت بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی تشریح کے لئے یہاں صرف مٹرکولیشن کے علم ہندسہ کی تعلیم پر روشنی ڈالی جائے گی۔ میٹرک کے لازمی ریاضی کے نصاب میں عملی ہندسہ رکھا گیا ہے جس میں صرف مختلف شکلوں کا بنانا سکھایا جاتا ہے اور ان عملوں کے ثبوت کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا۔ ان مسئلوں پر غور کیجئے تو ان میں سادہ ترین مسئلوں جیسے ایک خط کے دو مساوی حصے کرنے کے مسئلے کے علاوہ پیچیدہ ترین مسئلے بھی شامل ہیں۔ اب ہر سمجھ دار شخص یہ دریافت کر سکتا ہے کہ اگر افادیت ہی کسی مضمون کے پڑھانے یا چھوڑ دینے کا معیار ہو تو ان عملی مسئلوں کا طالب علم کو آئندہ زندگی میں کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ۹۹ فی صدی میٹرک کامیاب طلبہ کو یہ کب ضرورت پڑتی ہے کہ ایک ایسا دائرہ بنائیں جو ایک دئے ہوئے نقطے میں سے گذرے اور دو دئے ہوئے خطوں کو مس کرے۔ افادیت کا تو یوں خاتمہ ہوا۔ دوسری طرف آپ طالب علم کی مشکلات پر غور فرمائیے۔ ثبوت یا طریقہ استدلال سے تو وہ بالکل واقف نہیں ہوتا کہ ان کی بنا پر عمل کو خود نکال سکے اس لئے اس کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ طریقہ عمل کو زبانی یاد کرے اور امتحان میں بجنسہ دہرا دے۔

اس سوال پر کہ ریاضیات کے ابتدائی اصول سے واقفیت طلبہ کے ذہن و قوت استدلال کی تربیت کے لئے اور ان کو ایک مفید شہری بنانے کے لئے ضروری ہے یا نہیں ارباب اقتدار اور ارباب تعلیم ایک مرتبہ کامل غور و خوض کے بعد تصفیہ کر لیں اور اگر پڑھانا ہی ضروری سمجھا جائے تو پھر ان علوم کو اسی طریقہ سے پڑھانا چاہئے جو ان کے لئے ناگزیر ہے۔ علم ہندسہ کو بغیر ثبوت اور استدلال کے پڑھانا قطعی مہمل ہے اور یہ استدلال میٹرک کے طلبہ کی طاقت سے باہر بھی نہیں۔ اگر وقت کے ناکافی ہونے کا سوال ہے تو زیادہ حصہ پڑھانے کی ضرورت نہیں چند مسئلوں پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔

کالج کی تعلیم میں بھی بعض وقت اہم مسئلوں کے ثبوت غیر تشفی بخش طور پر دئے جاتے ہیں اور بنیادی مفہوم اور اصول جن پر سارے مضمون کا دارمدار ہوتا ہے اچھی طور پر نہیں سمجھائے جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبا ضابطوں کی مدد سے پیچیدہ سوال تو حل کر لیتے ہیں لیکن خود نفس مضمون کو واضح طور پر نہیں بیان کر سکتے۔ گذشتہ ہفتہ ہی کا واقعہ ہے کہ ایک بیرونی یونیورسٹی کے ایم ایس سی امتحان کے پرچوں

کو جانچتے وقت مجھے اس قسم کی افسوس ناک مثالوں سے سابقہ پڑا تھا۔

ہماری یونیورسٹیوں میں یہ بھی عیب ہے کہ اعلیٰ جماعتوں میں طریقہ تعلیم تقریباً اسی قسم کا ہے جو مدرسوں میں رائج ہے حالانکہ اس منزل پر کتابی تعلیم کی بہ نسبت خود طلبہ کے لکچروں اور مباحثوں کو زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے۔ یہ طریقہ سیمینار اور COLLOGUIUM کے نام سے مشہور ہے اور جرمنی و فرانس میں اس کا بہت رواج ہے۔ اس سے ایک طرف طلبہ کو جدید تحقیقات سے واقفیت اور مہارت ہوتی ہے تو دوسری طرف ان میں خود تحقیق و تجسس کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ یوں بھی حال حال تک ہمارے پاس یونیورسٹی کا مقصد اولین یہی سمجھا جاتا تھا کہ طلبہ کو نصابی تعلیم دے کر امتحان پاس کرایا جائے اور پھر ڈگری عطا کی جائیں۔ تحقیقاتی کام کا اگر کہیں کچھ انتظام تھا بھی تو اس کی اہمیت دوسرے درجہ پر تھی۔ شکر ہے کہ اب اس طرف بھی قدم اٹھنے لگا ہے اگرچہ اب بھی اس کی حقیقی اہمیت کے موافق اس کا انتظام نہیں ہوتا۔ چنانچہ اب بھی اکثر یونیورسٹیوں میں کتب خانے اور تجربہ خانے سائنٹفک طور پر منظم نہیں ہیں۔ تحقیقاتی رسالوں اور کتابوں کے منگوانے کی بہ نسبت درسی کتابوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مثلاً ریاضی اور طبیعیات کے رسالوں کو لیجیے ان علوم کے زیادہ نہیں تو کم از کم پچاس بہترین رسالے دنیا کے مختلف مقاموں سے نکلتے ہیں ہندوستان کے شاذ و نادر ہی کتب خانے ایسے ہوں گے جہاں آٹھ دس سے زیادہ رسالے موجود ہوں۔ بعض جگہ پیسوں کی کمی کا عذر ہے تو بعض جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے رسالے بہت کم لوگ پڑھ سکتے ہیں۔ جو لوگ پیسے نہ ہونے کا عذر پیش کرتے ہیں وہ دوسری نمائشی چیزوں کے لئے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں اور جو دوسری زبانوں سے ناواقفی کا عذر کرتے ہیں وہ خود انگریزی رسالوں اور کتابوں کی طرف بھی کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کی اہمیت سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ نسلوں کے لئے مواد کی عدم موجودگی کی وجہ سے تحقیقاتی کام میں کس قدر دشواریاں پیش آئیں گی۔

پھر بعض مقاموں پر جو فنڈ کی نام نہاد کمی کے باعث اہم رسالے یا کتابیں فراہم نہیں کر سکتے بعض دوسری کتابوں اور رسالوں کی اس قدر افراط ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا آخر اس کا کیا مصرف ہوگا۔ مثال

کے طور پر ایک رسالہ "نیچر" ہی کو لیجئے یہ انگریزی کا ایک مشہور رسالہ ہے جو لندن سے ہر ہفتہ نکلتا ہے اور یوں سمجھئے کہ سائنٹیفک نیوز ایجنسی کا کام دیتا ہے۔ یعنی چونکہ دوسرے رسالے ماہانہ سہ ماہی شائع ہوتے ہیں۔ اور ان میں طویل تحقیقی مضامین کے چھپنے کے لئے عرصہ لگتا ہے اس لئے محض ان انکشافات کا اعلان مختصر طور پر نیچر میں کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں بعض کتابوں کے تبصرے اور سائنٹفک مجلسوں کی مختصر روداد بھی شائع ہوتی ہے۔ کسی شخص کے لئے اس رسالہ کو ایک آدھ گھنٹہ سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت نہیں لیکن ہندوستان میں اکثر مقاموں پر صرف یونیورسٹی کے حدود کے اندر کم از کم نصف درجن کاپیاں اس رسالہ کی آتی ہیں جس کا چندہ تقریباً ۷۰ گنی دینا پڑتا ہے حالانکہ صرف ایک کاپی بھی ساری یونیورسٹی کے ضروریات کے لئے کافی ہے اس کی بچت سے دوسرے رسالے منگوائے جا سکتے ہیں جو بدرجہا زیادہ اہم ہیں۔

اسی ایک رسالہ کا ذکر تمثیلاً کیا گیا ہے ایسی بہت سی دوسری مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے درمیان اشتراک عمل نہیں ہوتا اور ہر شعبہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانا چاہتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تمام مشترکہ دلچسپیوں کے رسالے اور کتابیں یونیورسٹی یا خود شہر کے مرکزی کتب خانہ میں منگوائی جائیں۔ ان میں نیچر، فلاسفیکل میگزین، رائل سوسائٹی کے پروسیڈنگ، پیرس اکاڈیمی کے پروسیڈنگ وغیرہ شامل رہیں۔ جو رسالے صرف خاص موضوع پر ہوں اس شعبہ کے کتب خانہ میں منگوائے جائیں اور ہر اہم رسالہ ضرور منگوایا جائے چاہے اس کی قسط سے غیر ضروری مد میں یا انتظامی مصارف میں یا بالآخر اساتذہ کی تنخواہوں میں کمی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ رسالے الماریوں کی زینت ہی نہ رہیں بلکہ حتی الامکان ان کا استعمال کیا جائے۔ اس کے لئے اول تو خود اساتذہ کو ان سے واقف ہونا چاہیئے، پھر وہ طلبہ کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہر فرد کے لئے اس کا موقع نہیں ہے کہ ہر ایک تحقیقی مضمون کو تفصیل سے پڑھ کر سمجھ سکے اس لئے مناسب ہوگا کہ اپنے مذاق اور دلچسپی کے مطابق ہر استاد ایک مضمون کا انتخاب کرے اور رسالوں میں اس مضمون کے متعلق مختلف رسالوں میں جو تحقیقی مقالے شائع ہوئے ہیں ان کا خلاصہ سیمینار میں بیان کرے۔ اس ضمن میں چند مضمون اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کے سپرد کئے جا سکتے ہیں تاکہ وہ ان کے متعلق مواد فراہم کریں اور اچھی طرح مہارت حاصل کرنے کے بعد سیمینار میں لکچر دیں۔ اس طریقہ سے طلبہ کے معلومات اور تجربہ میں بہت اضافہ ہوگا اور تحقیقی کام کی طرف

بے حد ترغیب ہوگی۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان MIGRATION SYSTEM رائج کیا جائے یعنی اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ چند میقاتیں بیرونی جامعات میں دوسرے اساتذہ کی زیر نگرانی کام کرسکیں۔ اس سے ان کو نہ صرف مختلف ماہرین کے معلومات سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا بلکہ تعلیم کے متعلق مختلف تحریکوں سے بھی واقفیت ہو جائے گی جرمنی میں یہ طریقہ عام طور پر رائج ہے اور طلبہ کے خیالات کی وسعت اور پختگی میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔

لیکن ہر طالب علم کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے وطن کے علاوہ مختلف مقاموں میں تحصیل علم کر سکے اس لئے ضرورت ہے کہ مختلف جامعات آپس میں یہ انتظام کریں کہ ایک جگہ کے اساتذہ وقتاً فوقتاً دوسری جامعہ میں ایک یا دو میقاتوں تک لکچر دیتے رہیں۔ اس سے اساتذہ اور طلبہ دونوں کو بے حد فائدہ ہوگا۔ اگر یہ انتظام اس طریقہ پر کیا جائے کہ مثلاً مدراس سے ایک پروفیسر کلکتہ جائے اور کلکتہ سے ایک پروفیسر مدراس آئے تو میرے خیال میں زیادہ انتظامی دقتیں بھی نہیں ہوں گی۔ اور اگر ایسی دقتیں ہوں بھی تو انھیں کسی نہ کسی طرح حل کرنی چاہیئے۔ بعض مشکلات کے خوف سے کسی اہم اسکیم کو پس پشت ڈال دینا تدبیر کی علامت نہیں ہے۔

حضرات اس مختصر مضمون میں سائنس کی تعلیم کے متعلق چند خیالات نمونتہً آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے ہیں۔ جو کم و بیش دوسرے علوم کے متعلق اسی طرح صحیح ہیں۔ آج کل نہ صرف ہماری ریاست میں بلکہ کل ہندوستان میں تعلیم کی تنظیم جدید پر غور ہو رہا ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ مختلف پہلوؤں سے اس مسئلہ پر بحث کی جائے۔

بہت سی اہم باتیں وقت کی تنگی کے سبب یہاں چھوٹ گئی ہیں جو کسی آئندہ موقع پر تفصیلی معلومات کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔

زمین اور آبادی

(از جناب محمد عاقل صاحب ایم۔ اے۔ استاد معاشیات)

زمین اور آبادی میں جو گہرا تعلق ہے اسے کم و بیش ہر شخص سمجھتا ہے۔ زمین کے بغیر کوئی آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندہ رہنے کے لئے کھانے کپڑے اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تینوں چیزیں زمین سے ہی براہ راست یا بالواسطہ حاصل کی جاتی ہے۔ زمین میں بیج بویا جاتا ہے تو اس سے کھانے کے لئے اناج ترکاری اور پھل ملتے ہیں۔ کپڑے بنانے کے لئے روئی اور دوسرے ریشہ دار پودے تیار کئے جاتے ہیں جانوروں کو زمین پر ہی چراتے اور پالتے ہیں تب ان سے دودھ، گھی۔ گوشت کھالیں حاصل کی جاتی ہیں اور ان سے بوجھ اٹھانے اور کھینچنے کا کام لیا جاتا ہے۔ زمین کی مٹی سے مکانات بنا کر کھڑے کئے جاتے ہیں اور لوہا تانبا اور دوسری دھاتیں نکالی جاتی ہیں۔ غرضکہ زمین کے ایسے ہی بے شمار اور فائدے ہیں جن سے آبادی کے زندہ رہنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمین میں بصورت مجموعی کس قدر آبادی کے پرورش کرنے کی وسعت اور گنجائش پائی جاتی ہے۔ اس سوال کا ٹھیک جواب دینا تو مشکل ہے۔ کیونکہ زمین کے سب حصے ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ کچھ زمینیں آدمیوں کے لئے مفید ہوتی ہیں کچھ غیر مفید۔ کچھ زمینیں پتھریلی پہاڑی ہوتی ہیں کچھ دلدلی۔ کچھ میں جنگلات کثرت سے لگے ہوتے ہیں کچھ بالکل خشک ریگستان ہوتی ہیں۔ کچھ زرخیز ہوتی ہیں کچھ بنجر ہوتی ہیں۔ کچھ معدنیات سے پر ہوتی ہیں کچھ خالی اور بے کار ہوتی ہیں۔ کچھ کے فائدے کا علم لوگوں کو ہوتا ہے اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کے فائدے سے لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔ لیکن ہر زمین کو محنت کے ذریعہ کم و بیش مفید بنایا جاسکتا ہے اور جتنا انسان کی ایجاد اور اختراع کی قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے اتنی ہی آدمی کی محنت آسان ہوتی جاتی ہے اور پرانی بے کار زمینوں کو کارآمد اور زرخیز بنانے کا کام سہل ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے زمین میں آدمیوں کو پرورش کرنے کی جس قدر گنجائش ہے وہ کوئی قائم اور دائم چیز نہیں ہے

بلکہ علوم و فنون کی ترقی اور تنزل کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے ۔ ہمیں ہر عہد کے سرمایہ علم و فن کا لحاظ کرتے ہوئے زمین کی وسعت اور گنجائش کا فیصلہ کرنا ہوگا ۔

لیکن چند ظاہری باتیں ایسی ہیں جن سے آبادی اور زمین کے توازن کا کچھ نہ کچھ پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کسی ملک میں یہ دیکھیں کہ وہاں کے لوگوں کی عمریں اوسطاً زیادہ ہوتی ہیں ۔ ان کے قدوقامت سے توانائی اور تندرستی ظاہر ہوتی ہے ۔ چہرے تروتازہ اور شاداب ہوتے ہیں بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں ان کی تندرستیاں عموماً اچھی رہتی ہیں اور عمر کے زیادہ حصہ میں ان میں کام کرنے کی چستی، ولولہ، امنگ اور اہلیت پائی جاتی ہے تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ان کی زمین آبادی کی ترقی کے لئے[1] موزوں اور مناسب ہے اگر صورت حال اس کے برعکس نظر آئے تو ہمیں اس کے خلاف نتیجہ نکالنا چاہیئے ۔ خلاصہ اس تمام بحث کا یہ ہے کہ اگر زندگی کو قائم رکھنے والے اسباب، زندگی کو ختم کرنے والے اسباب کے مقابلہ میں زیادہ ہوں تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ فطری ماحول آبادی کی ترقی کے لئے موافق ہے اور یہ نہ ہو تو سمجھنا چاہیئے مخالف ہے ۔

جن مفکرین نے آبادی اور زمین کے تعلقات پر غور و فکر کیا ہے وہ زمین کی وسعت اور گنجائش کے بارے میں دو مختلف نتیجوں پر پہنچے ہیں جن سے معاشیات کے ماہروں کے دو گروہ بن گئے ہیں ایک گروہ کو ہم یاس مشربوں یعنی ایسے لوگوں کا گروہ کہہ سکتے ہیں جو زمین کی گنجائش کی کمی اور قدرتی وسائل دولت کی قلت

---

[1] یہاں میرے اس بیان سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ میں آبادی کے لئے صرف زمین کو ہی ایک تنہا ذریعہ معاش سمجھتا ہوں اور تجارت و صنعت اور علمی پیشوں کو جن کے لئے زمین کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے کوئی اہمیت نہیں دیتا ۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ بعض ملک ایسے ہو سکتے ہیں جو تجارت اور صنعت یا علمی پیشوں یا دوسری ذاتی خدمات کے ذریعہ اپنی آبادی کے معیار زندگی کو ایک بلند سطح پر قائم رکھ سکتے ہیں لیکن اس سے زمین کی بنیادی اہمیت ان ملکوں کیلئے بھی زائل نہیں ہو جاتی ۔ انھیں اپنی تجارت کے لئے سامان اور خریدار، اپنی صنعتوں کیلئے کچا مال، اپنے علمی پیشوں اور ذاتی خدمتوں میں مصروف رہنے والے لوگوں کے لئے غذا، اگر اپنے ملک کی زمین سے نہیں تو کسی نہ کسی دوسرے ملک کی زمین سے ضرور حاصل کرنا پڑتی ہے ۔ نوآبادی کے حاصل کرنے کیلئے سامراجی ملکوں میں جو کشمکش جاری ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ایسی صورت میں زمین اور آبادی کا مسئلہ صرف ایک ملک تک محدود نہیں رہتا کئی ملکوں بلکہ پوری دنیا پر پھیل جاتا ہے لیکن زمین اور طبعی ماحول پر انسانوں کا بصورت مجموعی جو انحصار ہے اس کی اہمیت بہرحال باقی رہتی ہے ۔ اس سے آبادی اور زمین کے مقابلہ کو وسیع رقبہ پر پھیلا کر تھوڑی مہلت حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اس مقابلہ کو سرے سے ختم نہیں کیا جا سکتا ۔

کو آبادی کی ترقی کے راستہ میں حایل دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زمین سے جتنی پیداوار حاصل ہو سکتی ہے اس کی مقدار محدود ہے اور انسانی آبادی میں اضافہ اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے دنیا کے سب لوگوں کو زمین کی پیداوار سے جی بھر کے فائدہ اٹھانے کا موقع کبھی بھی نہ مل سکے گا۔

دوسرا گروہ امید پروروں یعنی معاشیات کے ایسے ماہروں کا ہے جو انسانی ترقی کے بارے میں نہایت خوش آئند توقعات رکھتے ہیں۔ وہ زمین کی پیداوار کی کمی کو موجودہ افلاس اور زبوں حالی کا سبب قرار نہیں دیتے بلکہ وہ اس کا الزام غیر مساوی تقسیم دولت اور دوسری معاشری اور سیاسی خرابیوں پر رکھتے ہیں۔

آئیے ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ ان دونوں گروہوں کے عقائد کا مطالعہ کریں۔ پہلے یاس مشربوں کو لیجیے۔ اس گروہ کا سردار اور امام مالتھس ہے جس نے سب سے پہلے ان لوگوں کے پُرجوش حوصلوں کو سرد کرنے کی کوشش کی جو چاہتے تھے کہ دولت کی معقول تقسیم سے دنیا میں خوش حالی اور فارغ البالی کے دور سعید کا آغاز کریں اور دنیا کو بہشت کا ایک نمونہ بنا دیں۔ اس نے ان لوگوں کو تبلایا کہ تمہاری یہ تمام تمنائیں اور آرزوئیں ایک سودائے خام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ زمین کی پیداوار اور آبادی کے جو اٹل قوانین ہیں وہ تمہاری تمام کوششوں کو ضرور بالضرور برباد کر ڈالیں گے۔ آبادی کے اضافہ کا یہ قانون ہے کہ وہ دونی چوگنی آٹھ گنی بڑھتی ہے لیکن زمین کی پیداوار میں اضافہ ایک دو تین کی نسبت سے ہوتا ہے۔ آبادی اور غذا کے اضافہ کی رفتار میں جو کثیر فرق ہے اس سے غذا اور آبادی کا توازن بگڑتا رہتا ہے جس سے لوگوں میں غذا کے حاصل کرنے کے لئے کشمکش جاری ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہے کچھ کھانے سے محروم رہتے ہیں اور جب کبھی یہ توازن بہت زیادہ بگڑ جاتا ہے وبائیں پھیلتی ہیں۔ قحط سالی پیدا ہوتی ہے۔ خانہ جنگیاں اور بین الاقوامی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ غرضکہ فتنہ و فساد اور تکلیف و مصیبت کا دور دورہ جاری ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے آدمی مر جاتے ہیں۔ یا مارے جاتے ہیں اور اس طرح غذا اور آبادی کا بگڑا ہوا توازن دوبارہ برابر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر یہی سلسلہ از سر نو شروع ہو جاتا ہے۔ جو قومیں عقلمند اور عاقبت اندیش ہوتی ہیں وہ کوشش کرتی ہیں کہ اپنی آبادی کو حد سے زیادہ نہ بڑھنے دیں اور زیادہ اولاد کو قصداً اور ارادتاً پیدا نہیں ہونے

دیتیں اور اپنی اس پیشین بینی کی وجہ سے قدرتی مصیبتوں سے نجات حاصل کرلیتی ہیں اور جو ایسا نہیں کرتیں یا نہیں کرپاتیں انہیں وقتاً فوقتاً قدرت کی ان اصلاحی کوششوں کا مقابلہ کرنا اور اپنی ناعاقبت اندیشیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

مالتھس کے بعد رکارڈو نے زمین کی پیداوار کے بارے میں اپنا قانون پیش کیا جس سے مالتھس کے نظریہ آبادی کی جو خامی تھی وہ رفع ہوگئی۔ مالتھس اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان نہ کرسکا تھا کہ زمین کی پیداوار میں اضافہ تیزی کے ساتھ کیوں نہیں ہوتا۔ اس کی اس کسر کو رکارڈو نے پورا کردیا۔ اس نے لوگوں کے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر اس بات کو ثابت کیا کہ جب ایک ہی زمین پر زیادہ محنت اور لاگت لگائی جاتی ہے تو چاہے محنت اور لاگت پہلے کے برابر ہی لگائی جائے لیکن اس سے زمین کی پیداوار میں پہلے کے برابر اضافہ نہیں ہوتا بلکہ پہلے کی نسبت سے کم اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے اگر ایک روپے کی لاگت لگانے سے پیداوار میں ایک من کا اضافہ ہوا تھا تو بعد میں ایک روپیہ لگانے سے پون من کا اضافہ ہوگا اور چاہے لاگت کو برابر ایک ہی روپیہ سے ہم بڑھاتے جائیں لیکن پیداوار کا نیا اضافہ ہر پچھلے اضافہ کے مقابلہ میں گھٹتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ ایک حد ایسی بھی آسکتی ہے کہ ایک روپیہ کی مزید لاگت لگانے کے باوجود پیداوار میں کوئی مزید اضافہ نہ ہو۔ رکارڈو نے اپنے اس نظریے کا نام قانون تقلیل حاصل رکھا تھا۔

جب لوگوں نے رکارڈو کے اس قانون تقلیل حاصل کو مالتھس کے قانون آبادی کے ساتھ ملاکر دیکھا تو ان کے نزدیک زمین اور آبادی کا مسئلہ بالکل صاف ہوگیا۔ انھوں نے کہا آبادی کے بڑھنے سے اس میں شک نہیں کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور ہر نیا شخص ایک منھ کے ساتھ دو ہاتھ لے کر بھی پیدا ہوتا ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ منھ تو اتنی ہی غذا طلب کرتا ہے جتنی پہلے آدمیوں کے لئے ضروری تھی لیکن بعد کے آدمیوں کے ہاتھ پہلے آدمیوں کے ہاتھوں کے مقابلہ میں زمین سے کم غذا حاصل کرپاتے ہیں۔ نئے کام کرنے والے جب زمین پر کام شروع کرتے ہیں تو ہر چند وہ پرانے کام کرنے والوں کے برابر محنت کرتے ہیں لیکن پھر بھی انھیں پرانے کام کرنے والوں کے مقابلہ میں زمین سے غذا کی کم مقدار حاصل ہوتی ہے۔ اسے فطرت کا بخل کہیے جو چاہے کہیے لیکن یہ اپنی جگہ پر ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس لئے اگر آبادی زیادہ بڑھے گی تو لوگوں کے افلاس اور پریشان حالی میں بھی ضرور اضافہ ہوگا۔ مالتھس اور رکارڈو

کے بعد جان اسٹوراٹ مل نے اس نظریے کو ضروری ترمیم اور اصلاح کے بعد اور زیادہ بہتر شکل میں پیش کیا اور بعد میں مارشل نے اسے اور بھی زیادہ پسندیدہ شکل دے دی جس کی تائید جے۔ ایم کینس اور کیمبرج اسکول کے دوسرے ماہرین معاشیات نے جاری رکھی۔

اس یاس پسند گروہ کے مقابلہ میں جو انسانی ترقی کے امکانات کو محدود سمجھتا ہے دوسرا گروہ امید پروروں کا ہے جن کا کہنا ہے کہ انسانوں کی مرفہ الحالی اور معاشی ترقی پر قدرت کی طرف سے کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی ہے۔ وہ اپنے دعوے کی تائید میں کہتے ہیں کہ زمین کی زرخیزی میں پچھلے زمانے میں اضافہ ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ کاشت کے نئے طریقوں کے دریافت ہو جانے سے نئی نئی زمینیں زیر کاشت لائی جا رہی ہیں۔ پھر نئے ملکوں میں زرخیز زمینیں افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ دوسری طرف آبادی میں اضافہ اس قدر تیزی سے نہیں ہو رہا ہے جس کا اندیشہ مالتھس اور اس کے پیرووں نے کیا تھا۔ ایجاد واختراع کی جن نئی قوتوں کو انسان نے اپنے قبضے میں کر لیا ہے ان کے ذریعہ کثیر سے کثیر آبادی کے لئے مرفہ الحالی کے وسائل فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ آج جہاں کہیں بھی افلاس اور پریشاں حالی نظر آتی ہے اس کا اصل سبب آبادی کی کثرت نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب دوسرے ہیں۔ آبادی کی کثرت افلاس کا نتیجہ ہے اس کا سبب نہیں ہے۔ مالتھس نے اپنے زمانے میں انگلستان کو ضرورت سے زیادہ آباد بتلایا تھا اور تلقین کی تھی کہ انگلستان کو یا تو عاقبت اندیشی سے کام لے کر اپنی تعداد کو گھٹانا چاہیئے ورنہ قحط سالی، وبا اور خانہ جنگی کے پھیلنے کا اندیشہ ہے جس سے آبادی کو قدرت کی طرف سے جبراً کم کر دیا جائے گا۔ لیکن انگلستان کی آبادی کم ہونے کی جگہ دن دونی اور رات چوگنی بڑھتی رہی اور اس کثیر آبادی کے لئے امریکہ کی زائد پیداوار سے غذا اور اپنی ملکی پیداوار سے سامان آسائش فراہم ہوتے رہے۔ انگلستان کی موجودہ آبادی کثرت تعداد کے باوجود آج جس قدر خوش حال نظر آ رہی ہے اتنی مالتھس کے زمانہ میں نہیں تھی حالانکہ اس وقت آبادی آج کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ پھر یہ بات انگلستان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ تمام یورپ اور امریکہ کے متعلق یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ یورپ اور امریکہ اور دنیا کے زیادہ تر ملکوں کے سامنے آبادی کی زیادتی کا مسئلہ آج اس قدر اہم نہیں ہے جتنا آبادی کی کمی کا ہے۔

ایشیا کے چند ملکوں کو اگر چھوڑ دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے سیاسی رہنما اس وقت آبادی کو کم کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کے برعکس آبادی بڑھانے کی تدبیریں نکال رہے ہیں۔ غرضیکہ اس قسم کے واقعات اور مشاہدات تھے جنھوں نے امید پرور گروہ کو مالتھس اور کارڈو کی مخالفت پر آمادہ کیا تھا۔ اس گروہ کے ابتدائی علمبرداروں میں کیری، ہملٹن وغیرہ کے نام لایق ذکر ہیں۔ بعد میں ہنری جارج نے بھی ان کے نظریوں کی مخالفت میں حصہ لیا اور موجودہ زمانے میں ایڈورڈ کینن اور ان کے شاگرد ڈالٹن اور رابنس اور لنڈن اسکول آف اکنامکس کے دوسرے معاشی ماہروں نے مالتھس کے نظریے کے مقابلہ میں نئے حالات کو سامنے رکھ کر ایک نیا نظریہ یعنی نظریہ آبادی متناسب (OPTIMUM THEORY OF POPULATION) پیش کیا ہے۔

اس نظریے کے حامیوں کے نزدیک آبادی کی محض تعداد چاہے وہ کتنی ہی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو خطرناک چیز نہیں ہے۔ وہ آبادی کے اضافہ سے نہیں گھبراتے۔ جس چیز کو وہ خطرناک سمجھتے ہیں وہ غیر متوازن آبادی ہے یہ غیر متوازن آبادی تعداد کی کمی کی حالت میں بھی پائی جاسکتی ہے۔ اور تعداد کی زیادتی کی حالت میں بھی۔ اس کا تعلق محض تعداد سے نہیں ہے بلکہ تعداد کی طلب سے ہے۔ یہ ممکن ہے کہ عہد جہالت اور وحشت میں آج کی آبادی کے مقابلہ میں صرف ایک بٹہ ایک لاکھ آبادی پائی جاتی ہو لیکن پھر بھی دنیا ضرورت سے زیادہ آباد نظر آتی ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ آج سے پانسو سال بعد دنیا میں آج کے مقابلہ میں پچاس گنا آبادی زیادہ ہو اور پھر بھی دنیا ضرورت سے کم آباد معلوم ہو۔ آبادی کی تعداد بجائے خود مطلق طریقہ پر کوئی معیار نہیں بن سکتی بلکہ اسے طریقۂ پیداوار اور نظام معیشت سے نسبت دینے کی ضرورت ہے اور آبادی کی جس تعداد کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کا امکان پیدا ہوسکے وہی مناسب ترین آبادی ہے اور اسی کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ آبادی کے بڑھنے کا امکان طریقۂ پیداوار دولت اور انسانی ایجاد و اختراع کی ترقی کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ چیزیں چونکہ بدلتی رہتی ہیں اس لئے آبادی کی انتہائی حد بھی ایک جگہ قائم نہیں رہتی وہ بھی بدلتی رہتی ہے۔ مسٹر کار ساندرس بھی اسی نقطۂ خیال کے حامی ہیں۔ انھوں نے دنیا کی آبادی کو نسلوں کے اعتبار

سے تقسیم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یورپی نسل کے لوگ جہاں جہاں آباد ہیں وہاں آبادی کا رجحان کمی کی طرف ہے اور بعض ملکوں میں فی الحال اور بعض میں اب سے دس سال بعد اور بعض میں بیس سال یا اس سے زاید مدت میں آبادی کی یہ کمی ملک کے وسائل کو ترقی دینے کے لئے ناکافی ثابت ہوگی۔ صرف چین، ہندوستان اور چند دوسرے غیر یورپی ملک ایسے ہیں جن کی آبادی میں ترقی کی طرف رجحان پایا جاتا ہے اور ان کے قدرتی وسائل، طریقہ پیداوار دولت اور معیشت کی موجودہ تنظیم کا لحاظ کرتے ہوئے اندیشہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ملکوں میں آبادی کی کثرت کا مسئلہ آئندہ سالوں میں ایک خطرناک صورت اختیار کرے گا۔ یہاں ہم ہندوستان کے مسئلہ آبادی کا ذرا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کریں۔

(۲)

ہندوستان کے مسئلہ آبادی کے دو پہلو ہیں۔ پہلا پہلو تو یہ ہے کہ آیا ہندوستان میں اس وقت آبادی گنجائش سے زیادہ ہے یا نہیں اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ صورت حال قائم اور جاری رہنے والی ہے یا ختم ہونے والی ہے۔ پہلے پہلو کا بالواسطہ ثبوت تو امراض اور اموات کے اعداد پیش کر کے دیا جا سکتا ہے اور بلا واسطہ ثبوت غذا کی رسد کا تخمینہ کر کے۔ اگر اس تخمینہ سے یہ ثابت ہو کہ غذا ناکافی ہے اور دوسرے ملکوں سے مصنوعہ اشیا یا خدمات کے معاوضہ میں غذا کی فراہمی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو ہندوستان کی آبادی کو بساط اور گنجائش سے زیادہ کہا جائے گا اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہوگا کہ آیا یہ صورت حال قائم رہنے والی ہے یا ختم ہونے والی یہ صورت حال دو ہی صورتوں میں ختم ہو سکتی ہے یا تو یہ ہو کہ وسائل غذا میں آبادی کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے اضافہ ہو یا پھر یہ ہو کہ آبادی تیزی کے ساتھ گھٹنا شروع کر دے۔ اب آیئے ان سوالوں کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا جائے۔

کسی ملک کی آبادی اور اس کی زمین میں جو باہمی تعلق پایا جاتا ہے اس کی نوعیت کا اگر پتہ چلانا ہو تو اس کی سہل ترین صورت یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس ملک میں لوگوں کی عمر اوسطاً کیا ہوتی ہے یعنی جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ کتنی مدت تک زندہ رہتے ہیں۔ ہر ملک میں کچھ بچے تو ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ اسی بچاسی برس کی عمر تک پہنچتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو چالیس پچاس سال سے آگے نہیں بڑھتے اور کچھ پیدا ہونے کے

دو تین دن بعد ہی مرجاتے ہیں۔ لیکن ان مختلف عمروں تک پہنچنے والوں کے تناسب ہر ملک میں مختلف ہوتے ہیں۔ طویل عمر تک پہنچنے کا انحصار بچے کی قوت حیات پر ہوتا ہے۔ بچے کی قوت حیات پر نسل اور وراثت کا بھی اثر پڑتا ہے۔ لیکن زیادہ اہم اثر گرد و پیش کے حالات کا پڑتا ہے۔ زندگی کی ترقی کے لئے پہلی ضرورت کافی اور مناسب غذا کھلی اور صاف ہوا میں ورزش اور جسم کا آرام ہے۔ دوسری ضرورت سردی گرمی اور دوسرے مخالف موسمی اثرات سے بچاؤ کی تدبیریں ہیں۔ تیسری ضرورت زندگی کے دشمن جو جراثیم اور امراض ہیں ان سے جسم کو محفوظ رکھنا ہے اور چوتھی ضرورت یہ ہے کہ اگر ان ابتدائی مدافعانہ تدبیروں کے باوجود کوئی شخص امراض کا شکار ہو جائے تو اس کے علاج کا معقول انتظام موجود ہو۔ اگر یہ سب چیزیں فراہم ہو جائیں تو ہر بچہ کے لئے زیادہ عمر تک زندہ رہنے کی توقع بہت بڑھ جاتی ہے۔

یوں تو انسان فانی ہے اور پیدا ہونے کے بعد مرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن جتنے زیادہ دن تک اس اٹل تقدیر کو ٹالا جا سکے اتنی ہی انسان کی کامیابی ہے۔ دنیا کے مہذب ملکوں نے اس سلسلہ میں جو معیار قائم کئے ہیں وہ ہمارے لئے ایک نمونہ اور مثال ہیں۔ ڈنمارک میں پیدائش کے وقت بچوں کے زندہ رہنے کی توقع اوسطاً ۷۰ برس کی جاتی ہے۔ انگلستان اور ویلز میں ۶۵ سال تک جرمنی میں پچاسی سال تک اور فرانس میں ۹۸ سال تک۔ لیکن ہندوستان میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان کے جینے کی توقع اوسطاً ۲۲ سال کی ہوتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب بچے صرف ۲۲ سال تک جیتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ بہت سے بچے کم عمری اور نوجوانی میں مرجاتے ہیں اور بہت کم اسی پچاسی سال تک کی عمر تک پہنچ پاتے ہیں اور اگر اوسط نکالا جائے تو لوگوں کی عمروں کا اوسط ۲۲ سال سے زیادہ نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ اس افسوسناک حالت کے کیا وجوہ اور اسباب ہیں؟ کیا ہمارے بچوں کا بیج کمزور ہوتا ہے انھیں اپنے والدین سے بہت کم قوت حیات کا ترکہ ملتا ہے۔ کیا ماں کے پیٹ میں انھیں مناسب غذا اور آرام نہیں ملتا۔ کیا پیدا ہونے کے بعد بچے کو اس کی ماں ایسا دودھ نہیں پلا سکتی جو اس کی قوت حیات کو مضبوط کر سکے۔ کیا دودھ چھوٹنے کے بعد بچپنے کے نازک دور میں بچوں کی غذا ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت کا جو بندوبست ہونا چاہیئے وہ نہیں ہوتا۔ کیا ان کی نشو و نما اور ترقی کا سلسلہ ابتدا میں ہی رک جاتا ہے۔ کیا

امراض کے مقابلہ کرنے اور ان کو رفع کرنے کی قوت ان میں پیدا نہیں ہوتی۔ سردی گرمی کو برداشت نہیں کر سکتے موسم کا ذرا سا تغیر ان کے نظام جسم میں ابتری پیدا کر کے انھیں بیمار ڈال دیتا ہے۔ کھانسی بخار ملیریا، انفلوئنزا، ٹائیفائیڈ، تپ دق، ہیضہ، چیچک، پلیگ وغیرہ کے وہ شکار رہتے ہیں۔ عورتیں زچگی کی حالت میں بخار میں مبتلا ہو کر مرجاتی ہیں۔ یہ سوالات ہیں جو پیدا ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں ہر شخص اپنے ذاتی تجربے سے اس بات کی شہادت پیش کر سکتا ہے کہ در حقیقت ہمارے بدنصیب ملک میں صورت حال ایسی ہی ہے۔ ہماری ملک کی شرح اموات ۲۹ فی ہزار ہے۔ معاشیات کے ماہروں نے ایک اوسط ملک کے لئے کمترین شرح اموات ۱۵ فی ہزار قرار دی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی شرح اموات اس اوسط سے ۲ ½ گنا زیادہ ہے۔ پھر جب مختلف عمروں کی موتوں پر نظر کی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں بچوں کی شرح اموات تمام مہذب ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ جتنے بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے تقریباً ⅕ ایک برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے مرجاتے ہیں اور اموات کی کل شرح میں بچوں کی موتوں کا تناسب ⅕ ہے۔ شہروں میں خصوصیت کے ساتھ حالت نہایت افسوسناک ہے۔ مثلاً بمبئی میں ایک ہزار پیدا ہونے والے بچوں میں سے ۵۵۶ بچے بچپنے میں ہی مرجاتے ہیں ؎

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

برخلاف اس کے لندن میں ایک ہزار بچوں میں صرف ۷۰ بچے بچپنے کی عمر میں مرتے ہیں ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

ایک زمانہ تھا جب یورپ کے ملکوں میں بھی ہندوستان کی طرح شرح اموات بہت زیادہ تھی لیکن اسی صدی کے دوران میں وہاں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔

ہمارے یہاں بچے پیدا بہت ہوتے ہیں۔ ہماری شرح پیدائش ۳۴ فی ہزار ہے۔ معاشیات کے ماہروں نے ایک اوسط ملک کے لئے زیادہ سے زیادہ شرح پیدائش ۳۵ فی ہزار مقرر کی ہے۔ ہم اس لحاظ سے اس معیار کے بہت قریب ہیں۔ لیکن ہماری شرح اموات چونکہ بہت زیادہ یعنی ۲۴ فی ہزار ہے اس لئے

باقی رہنے والے بچوں کا تناسب پانچ فی ہزار سے زیادہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری مجموعی آبادی میں اضافہ ہماری شرح پیدائش کے تناسب سے نہیں ہوتا۔

طبی تحقیقات کا کام کرنے والے عالموں کی جو آل انڈیا کانفرنسیں ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۶ء میں ہوئی تھیں ان میں دونوں مرتبہ ایک رزولیوشن ایک ہی طرح کے الفاظ میں بجنسہ منظور کیا گیا تھا۔ اس رزولیوشن کا خلاصہ یہ تھا:-

"اس کانفرنس کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ ہر سال ایسے امراض سے جن کا تدارک ممکن ہے، ہندوستان میں تقریباً پچاس ساٹھ لاکھ آدمی مرجاتے ہیں۔ جو لوگ امراض میں مبتلا ہوکر اچھے ہوجاتے ہیں ان کی محنت سے اوسطاً فی شخص دو تین ہفتہ تک ملک محروم رہتا ہے۔ لوگوں کے کام کی اہلیت میں امراض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جو کمی واقع ہوتی ہے وہ بیس فی صدی سے ہرگز کم نہیں ہوتی پیدا ہونے کے بعد جو بچے جوان ہوکر دولت کماتے ہیں ان کا تناسب پچاس فی صدی سے زیادہ نہیں ہے حالانکہ نہایت آسانی سے اسے اسی یا نوے فی صدی کیا جاسکتا ہے۔ کانفرنس کا یہ عقیدہ ہے کہ اوپر جو تخمینے پیش کئے گئے ہیں ان میں اعداد کو مبالغہ کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ واقعی صورت حال اس سے کہیں زیادہ خراب ہے اور ہندوستان کو ہر سال اربوں روپیہ کا نقصان قابل علاج بیماریوں کی وجہ سے اٹھانا پڑتا ہے اور ان کی وجہ سے کروڑوں آدمی غیر ضروری درد اور تکلیف، رنج اور مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں۔"

یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو طبی تحقیقات کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور اس میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ موجودہ صورت حالات نہایت افسوسناک ہے۔ اب آئیے اس کے بنیادی سبب کا بھی پتہ لگایا جائے۔

اس کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا سبب غذا کی کمی ہے۔ لوگوں کو مناسب غذا کافی مقدار میں نہیں ملتی۔ نوعمری کی شادی اور والدین کی کمزوریوں کی وجہ سے اس میں شک نہیں اولاد کی قوت حیات پر برا اثر پڑتا ہے لیکن اگر بچے کی تربیت اور نگہداشت ابتدا سے ہی اچھی طرح سے کی جائے تو بڑی حد تک اس

اثر کو زائل کیا جا سکتا ہے اور چند نسلوں میں کمزور بچوں کی جگہ طاقتور بچے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے پہلا اور نہایت اہم سوال کافی اور مناسب غذا کا ہے۔ بچوں کے لئے اچھا اور بہت سا دودھ چاہیئے۔ ماں کا دودھ گائے کا دودھ بھینس کا دودھ نوجوانوں اور بالغوں کے لئے مکھن، گھی، دودھ، اناج، ترکاری، پھل، انڈا، گوشت، شکر اور شہد چاہیئے۔ یہ چیزیں مہیا کر دیجئے آپ کے بچوں کی شرح اموات کم ہو جائے گی، آپ کے جوان امراض سے محفوظ ہو جائیں گے۔ ان کی کارگذاری کی اہلیت میں اضافہ ہوگا۔ ان میں مقابلہ کا اور مسابقت کا ولولہ اور امنگ پیدا ہوگی۔ وہ آگے بڑھیں گے اپنے معاملات کا خود بندوبست کریں گے۔ دوسری قوموں میں عروج و امتیاز حاصل کریں گے۔ ساری دنیا ان پر رشک کرے گی۔ وہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک عذاب نہیں بنیں گے بلکہ رحمت اور محبت کے فرشتے بن سکیں گے۔ اپنے معاملات کا خود بندوبست کریں گے اور دوسری قوموں میں عروج و امتیاز حاصل کریں گے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مناسب اور کافی غذا کہاں سے دی جائے۔ غذا کا ذخیرہ زمین میں دفن ہے۔ زمین کو کھود کر اور نباتات کی نشو و نما اور پختگی کے لئے فطرت کی طرف سے جو مدت مقرر کی گئی ہے اس کا انتظار کر کے اسے حاصل کیا جاتا ہے اس لئے غذا کے اس ذخیرے کو زمین سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے چاہے یہ زمین اپنے ملک کی ہو چاہے دوسرے ملکوں کی۔ دوسرے ملکوں کو ان کی غذا کے رسد کے معاوضہ میں دینے کے لئے کچھ سامان یا اہلیت اپنے پاس موجود ہونا چاہیئے تب ہی دوسرے ملک خوشی سے اپنی غذا کے ذخیرے میں ہمیں شریک کریں گے ورنہ ہمیں اپنے ملک کے غذا کے ذخیرے پر ہی قناعت کرنا پڑے گی۔

ہندوستان کی آبادی چونکہ زیادہ تر زراعت پیشہ ہے اس لئے یہاں کے لوگ اپنی غذا کی چیزیں اپنے ملک کی زمین سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ پتہ لگانا ہے کہ ہندوستان میں آج کیا صورت حال ہے۔ کیا یہاں کی زمین اپنی آبادی کو کافی مقدار میں غذا دے رہی ہے یا دے سکتی ہے یا نہیں دے رہی ہے اور نہیں دے سکتی ہے۔ شرح اموات اور امراض کی حالت کا جو بیان اوپر کیا گیا ہے اس سے تو یہ بات بالواسطہ ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں غذا کی رسد کافی نہیں ہے۔ لیکن یہ شہادت قطعی نہیں ہے

کیونکہ دوسرے اسباب بھی ایسے ہو سکتے ہیں جو تندرستی اور زندگی کے قیام اور ترقی میں حایل ہوں۔ لوگ جاہل اور بے تمیز ہو سکتے ہیں۔ حفظان صحت کے سیدھے راستے کو چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا ہو سکتے ہیں لیکن میرا یہ دعوے ہے کہ ہندوستان میں یہ تمام باتیں ثانوی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس ملک میں ابتدائی اہمیت غذا کی کمی کو حاصل ہے اور اس کا ثبوت میں ابھی پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر شاہ اور مسٹر کھمباتا نے ۱۹۲۴ء میں اپنی مشترکہ کتاب ویلتھ اینڈ ٹیکس ایبل کیپے سٹی آف انڈیا شائع کی تھی۔ اس کتاب میں پروفیسر شاہ نے ایک طرف تو ہندوستان میں غذا کی جو سالانہ پیداوار ہے اس کا تخمینہ کیا تھا۔ اس میں ہر قسم کے اناج اور غذاؤں کا لحاظ رکھا گیا تھا اور دوسری طرف یہ دیکھا تھا کہ کمترین خوراک جو ہندوستان کی آبادی کے لئے ضروری ہے اس کی کیا مقدار ہے۔ اس خوراک کا تخمینہ اس طرح کیا گیا تھا کہ پہلے تو سرکاری طور پر مختلف موقعوں پر جو کمترین غذا ایک آدمی کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے اس کے اعداد کو جمع کیا گیا۔ مثلاً ہندوستان کی جیلوں میں قیدیوں کو جو روزانہ خوراک دی جاتی ہے۔ بمبئی کے صوبہ میں قحط سالی کے زمانہ میں جو خوراک ایک ایک آدمی کو تقسیم کی گئی۔ ہندوستانی فوج اور ملاحوں کو حکومت کی طرف سے جو راشن دیا جاتا ہے ان کے اعداد جمع کئے گئے۔ پھر بمبئی کے مزدور جس قدر غذا اوسطاً کھاتے ہیں تحقیقات کے بعد اس کے اعداد جمع کئے گئے۔ پھر یورپ کے مزدور جتنی قدر غذا کھاتے ہیں اس کے اعداد دیئے گئے اور ان سب کا اوسط نکال کر ایک اوسط آدمی کی غذا کا تخمینہ لیا گیا۔ پھر مردوں کے اس اوسط سے عورتوں اور بچوں کی خوراک کے لئے ایک اوسط مقرر کیا گیا اور پھر تمام ہندوستان کے لوگوں کے لئے اوسطاً جس قدر کم سے کم غذا چاہیئے اس کا تخمینہ کیا گیا۔ اس باقاعدہ تحقیقات کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ کمترین غذا کی جتنی ہندوستان کے لوگوں کو ضرورت ہے اس کے مقابلہ میں انھیں جو غذا اس وقت مل رہی ہے وہ چالیس فی صدی کم ہے۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو ہندوستان کے ہر تین آدمیوں میں سے ایک آدمی بالکل بھوکا رہے۔ یا تینوں آدمی ایک تہائی بھوکے رہیں عموماً دوسری ہی صورت پر عمل ہوتا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی عام طور پر فاقہ زدہ نظر آتے ہیں اور ان کی قوت حیات اور بیماریوں کو دفع کرنے کی قوت بہت کم ہوتی ہے۔

اس قسم کے تخمینے اور لوگوں نے بھی کئے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ لایق ذکر ڈاکٹر ڈوبے کا تخمینہ ہے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ان میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ ایک صاف اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندوستانیوں کی غذا کی رسد ان کی ضرورت کے مقابلہ میں ناکافی ہے۔ بچوں کو کمزور اور فاقہ زدہ ماؤں کا دودھ پینا پڑتا ہے۔ جانوروں کا دودھ بھی مناسب چارہ نہ ملنے کی وجہ سے کمزور ہوتا ہے اور اس کی مجموعی رسد بھی بہت قلیل ہے جس کی وجہ سے ہر شخص اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ غلہ اور اناج جن کے بغیر گذر کی کوئی صورت ہی نہیں ہے وہ بھی کافی مقدار میں نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ تندرستی کو قائم رکھنے کے لئے جن دوسری چیزوں کی ضرورت ہے مثلاً ترکاری، شکر، مکھن، گھی، انڈا، گوشت، پھل یہ چیزیں تو صرف چند خوش نصیب لوگوں کو میسر آتی ہیں باقی تمام تر آبادی ان چیزوں سے محروم رہتی ہے۔ نتیجہ اس کا شرح اموات کی کثرت اور بیماریوں کی اس ہمہ گیری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جن کے بارے میں اعداد درج کئے جا چکے ہیں۔

غرضکہ جو کچھ اب تک بیان کیا گیا اس سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ ہندوستان کی زمین یہاں کی آبادی کے لئے جتنی چاہیئے اتنی غذا پیدا نہیں کر رہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کا کیا علاج ہے صحت اور زندگی کے قائم رکھنے کے لئے جو دوسری چیزیں چاہیئے انھیں تو فی الحال چھوڑئیے۔ صرف غذا کے مسئلہ کو لیجئے، غذا کی کمی کئی طریقوں سے دور کی جا سکتی ہے۔ پہلا طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ غذا کی رسد کو بڑھایا جائے۔ غذا کی رسد بڑھانے کی تین صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خود اپنے ملک میں جتنی غذا پیدا ہوتی ہے اس کی مقدار بڑھائی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ملک سے باہر جو غذا جاتی ہے اسے روکا جائے اور تیسری صورت یہ ہے کہ باہر کے ملکوں سے غذا اپنے ملک میں منگائی جائے۔ ان تدبیروں سے تو ملک کے اندر غذا کی مقدار کو بڑھایا جا سکتا ہے لیکن دوسرا طریقہ توازن پیدا کرنے کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غذا کھانے والوں کی تعداد کو کم کیا جائے یعنی آبادی کو گھٹایا جائے۔ آبادی کو دو طرح سے کم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ اپنے ملک کی زائد آبادی کو دوسرے کم آباد ملکوں میں بھیجا جائے اور دوسرے اس طرح کہ نئی اولاد پیدا کرنا بند کیا جائے تاکہ جو بوڑھے اور بیمار مرتے جائیں ان کی جگہیں اس وقت تک خالی رہیں

جب تک آبادی اور غذا میں توازن نہ پیدا ہو جائے۔ تیسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ملک میں صنعتوں کو ترقی دی جائے۔ ملک کی صنعتی پیداوار کو بڑھایا جائے۔ باہر کے ملکوں کی مصنوعات منگانا بند کیا ہے تاکہ ان ملکوں کی مصنوعات کے معاوضہ میں ملکی غذا کی جو مقداریں باہر بھیجنا پڑتی ہیں وہ نہ بھیجنا پڑیں اپنے ملک سے دوسرے ملکوں کو مصنوعات روانہ کی جائیں اور اپنی مصنوعات کے معاوضہ میں ان ملکوں سے اشیاء غذا حاصل کی جائیں۔ چوتھا اور آخری طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ اوپر جتنے طریقے بتلائے گئے ہیں ان سب کو جمع کیا جائے اور سب کو بہ یک وقت اختیار کیا جائے۔

آئیے ان تدبیروں میں سے ایک ایک کو الگ الگ لے کر دیکھیں کہ یہ کس حد تک مفید اور قابل عمل ہیں

پہلی تدبیر یہ ہے کہ ملک میں جتنی غذا پیدا ہوتی ہے اس کی مقدار بڑھائی جائے۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ موجودہ طریقہ کاشت کو جاری رکھتے ہوئے اجناس خوردنی کے تناسب کو بڑھایا جائے اور اجناس غیر خوردنی کے تناسب کو گھٹایا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ زراعت کو عام طور پر وسعت دی جائے اور اس طرح کسانوں کی قوت خرید کو بڑھایا جائے تاکہ بعد میں وہ جو چاہیں خرید سکیں۔

آئیے پہلے پہلی صورت کو لیں۔ ہندوستان میں اجناس خوردنی کا تناسب ۷۰ فی صدی ہے اور اجناس غیر خوردنی کا تناسب ۱۰ فی صدی ہے۔ اجناس غیر خوردنی عموماً تجارتی اجناس ہیں اس لئے ان کی کاشت عموماً بہتر قسم کی زمینوں پر کی جاتی ہے۔ اگر ان کی کاشت کو بند کر دیا جائے تو غذا کی رسد میں کم سے کم ۱۰ فی صدی کا ضرور اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن کسان کا مقصد محض اپنی غذا کی رسد بڑھانا نہیں ہے بلکہ کسان کو لگان وغیرہ ادا کرنے کے لئے نقد رقم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کسان تجارتی فصلوں کو اس لئے بوتا ہے کہ ان کے بونے سے اسے نقد رقم حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ان کی کاشت بند کرے گا تو زمیندار اور سرکار کا مطالبہ ادا کرنے میں ضرور اسے دشواری پیدا ہوگی اور اسے اپنے کھیت تک سے بے دخل ہونا پڑے گا۔ اس لئے کسان کے لئے موجودہ حالات میں یہ طریقہ کچھ زیادہ مفید نہیں معلوم

ہوتا۔

اب دوسرے طریقے یعنی زراعت کی عام ترقی کو لیجئے۔ اس سلسلہ میں ترقی کی گنجائش ہے لیکن بہت زیادہ نہیں ہے۔ زراعتی ترقی کے لئے پہلی ضرورت آبپاشی کا انتظام ہے۔ ہندوستان کے کل رقبہ میں سے تقریباً ⅕ حصہ کی آبپاشی کی جاتی ہے باقی ⅘ رقبہ کی فصلیں برسات کے رحم و کرم پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ بارش مناسب موقع پر اور کافی مقدار میں ہو جائے تو فصل اچھی ہو جاتی ہے ورنہ فصل خراب ہو جاتی ہے۔ بارش کے غیر یقینی ہونے سے ملک کی پیداوار کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کا تخمینہ کسی حالت میں کروڑوں اور اربوں روپیوں سے کم نہیں ہے۔ لیکن آبپاشی کا انتظام ہر جگہ ممکن نہیں ہے اور جہاں ممکن ہے وہاں آبپاشی کے ذرائع کو تعمیر کرنے میں بہت زیادہ سرمایہ لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہندوستان کے جتنے رقبہ پر آبپاشی ہوتی ہے اس میں تقریباً آدھا ایسا رقبہ ہے جس کی آبپاشی سرکاری نہروں اور تالابوں کے ذریعہ ہوتی ہے اور آدھے کی پرائیویٹ ذرائع سے۔ سرکاری نہروں وغیرہ سے کل مزروعہ رقبہ کے صرف ۱/۱۲ حصہ کی آبپاشی ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے بنانے میں حکومت کو ایک ارب ۳۶ کروڑ کا سرمایہ لگانا پڑا تھا یعنی فی ایکڑ ۷۲ روپیہ کا سرمایہ۔ پھر یہ سرمایہ اس وقت لگانا پڑا تھا جب پانی کی بہم رسانی کے ایسے ذرائع موجود تھے جن سے آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھانا ممکن تھا۔ اب ایسے ذرائع بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے آبپاشی میں مزید اضافہ کروڑوں روپیہ صرف کئے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

زراعتی ترقی کے لئے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ کسانوں کی جوت میں کافی بڑے رقبہ ہوں۔ کسانوں کی جوت میں اس وقت جو رقبے ہیں وہ بہت مختصر ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں بنگال میں جو لوگ کھیتی کا کام کرتے تھے ان کی جوت میں اوسطاً ۲،۲ ایکڑ کا رقبہ تھا۔ ہندوستان کے دوسرے بڑے صوبوں میں اس رقبہ کا اوسط ۳ ایکڑ ہوتا تھا۔ بمبئی، سرحدی صوبہ اور پنجاب میں البتہ یہ رقبہ اوسطاً ساڑھے دس ایکڑ ہوتا تھا۔ یہ رقبے اتنے مختصر ہیں کہ ان پر مشین اور دوسرے جدید سائنٹیفک طریقوں کا استعمال نفع کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ آبادی کے اضافہ اور صنعتوں کی کمی کی وجہ سے کسانوں کی جوت میں جو رقبے ہیں

وہ نسل بعد نسل گھٹتے چلے جارہے ہیں اور جب تک آبادی نہ گھٹے یا صنعتیں اور دوسرے پیشے آبادی کی ایک کثیر تعداد کو اپنے اندر جذب نہ کریں اس وقت تک زراعت کی ترقی میں یہ چیز بہت زیادہ حایل ہوگی حکومت کی طرف سے قوانین بناکر اور امداد باہمی کی انجمنیں قائم کرکے کسان کے کھیتوں کے انتشار کو رفع کرنے کی تدبیریں کی جارہی ہیں لیکن اس میں بھی روپیہ کا خرچ زیادہ ہے۔

زراعتی ترقی کے اور دوسرے کاموں کے لئے بھی روپیہ کی ضرورت ہے مثلاً اچھے بیج، اچھے کھاد، اچھے اوزار، اچھے بیل، جانوروں اور کیڑوں سے فصل کی محافظت، پودوں کی بیماریوں کا علاج، جتائی، بوائی، نرائی کے نئے طریقوں کی تعلیم، ایک مقررہ معیار کی یکساں پیداوار حاصل کرنا، پیداوار کو اچھے نرخ پر ملکی اور غیر ملکی منڈیوں میں فروخت کرنا، نئی نفع بخش فصلوں کی کاشت، مکھن، شہد، مرغی اور گوشت کی پیداوار بڑھانا۔ نئی زمین کو کاشت میں لانا۔ ان سب کاموں کے لئے ابتدا میں سرمایہ لگانے کی ضرورت ہے۔ اور ان کے بارے میں جو علمی تحقیقات ہوچکی ہیں ان سے واقفیت کی ضرورت ہے۔ غرضکہ ان طریقوں سے غذا کی پیداوار اسی صورت میں بڑھائی جاسکتی ہے جب زیادہ سرمایہ، زیادہ دماغی اور جسمانی محنت اور زیادہ تنظیم سے کام لیا جائے۔

اوپر جو باتیں بیان کی گئیں ان سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ہندوستان میں غذا کی پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے لیکن آسانی سے نہیں بلکہ زیادہ سرمایہ اور محنت صرف کرنے کے بعد جتنی زیادہ غذا کی ضرورت ہوگی اس نسبت سے بہت زیادہ سرمایہ اور محنت خرچ کرنا پڑے گی۔ ہندوستان نیا ملک نہیں ہے بلکہ یہاں ہزاروں برسوں سے زمین پر مسلسل کاشت ہوتی چلی آرہی ہے۔ اس لئے یہاں قانون تقلیل حاصل کا عمل جاری ہے اور جب تک اجناس خوردنی کی قیمتوں میں ترقی نہ ہو زمین میں نفع کے ساتھ سرمایہ اور محنت کی زیادہ مقدار نہیں لگائی جاسکتی۔

غذا کی رسد بڑھانے کی اس صورت کو تو ہم نے دیکھ لیا۔ اب آیئے دوسری صورت کو لیں یعنی یہ دیکھیں کہ ملک سے باہر جو غذا جاتی ہے اسے ہندوستان کے لوگوں کے لئے باہر جانے سے کس حد تک روکا جاسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ اشیار غذا کی مجموعی

پیداوار کا جو حصہ برآمد کیا جاتا ہے وہ بہت کم ہے اور برابر کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے اب اشیاء غذا کی برآمد کو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی ہے۔ کھانے کی چیزوں کی برآمد کو قانوناً بند کرنے سے ملک کے لوگوں کو فائدہ پہنچنا یقینی نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں کسان اپنے نفع کی خاطر ان چیزوں کا بونا ترک کر کے تجارتی فصلیں بونا شروع کر دیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ دوسری تدبیر بھی غذا کی رسد نہیں بڑھا سکتی۔

اب تیسری تدبیر کو لیجئے یعنی باہر کے ملکوں سے زیادہ غذا اپنے ملک میں منگائی جائے۔ باہر کے ملکوں سے غذا اسی وقت منگائی جا سکتی ہے جب ملک کے اندر ضروری قوت خرید موجود ہو۔ قوت خرید آمدنی کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہندوستان کی اوسط آمدنی جس قدر کم ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ آمدنی اور قوت خرید زیادہ ہوتی تو ملک میں بھی زراعت کو خاصی ترقی دی جا سکتی تھی اور باہر سے بھی کھانے کی چیزیں منگائی جا سکتی تھیں۔ یورپ کے صنعتی ملک اپنی تمام غذا اپنے ملک میں پیدا نہیں کرتے بلکہ دوسرے ملکوں سے منگاتے ہیں۔ ان کے پاس چونکہ دوسرے ملکوں کو اپنی مصنوعات غذا کے معاوضہ میں دینے کے لئے موجود ہوتی ہیں اس لئے وہ ایسا کرتے ہیں۔ ہمارے پاس چونکہ باہر بھیجنے کے لئے مصنوعات نہیں ہیں اس لئے ہمارے لئے باہر سے کھانے کی چیزیں منگانا ممکن نہیں ہیں۔ ہم ہمیشہ انگلستان کے مقروض رہتے ہیں اور اس قرض کی ادائگی کے سلسلہ میں سالانہ ہمیں اپنے ملک کی کھانے کی چیزیں اور کچا مال ولایت بھیجنا پڑتا ہے۔ جب صورت یہ ہے تو ہم کیسے دوسرے ملکوں سے کھانے کی چیز منگا سکتے ہیں۔

غرضکہ غذا کی رسد بڑھانا بہت مشکل ہے اب توازن کے پیدا کرنے کی دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ آبادی کو کم کیا جائے۔ آبادی کو جیسا میں نے ابھی بیان کیا دو طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ملک کی زیادہ آبادی کو دوسرے کم آباد ملکوں میں منتقل کیا جائے اور دوسری یہ ہے کہ نئی اولاد پیدا کرنا بند کیا جائے۔ ہندوستان سے دوسرے ملکوں کو آبادی کے منتقل کر دینے کے امکانات بہت کم ہیں۔ دنیا میں بہت سے نئے ملک اور نو آبادیاں ایسی ہیں جن میں اگر ہندوستانی منتقل کر دئے

جائیں تو اس سے ان ملکوں اور ہندوستان دونوں کا فائدہ ہو۔ لیکن ان سب ملکوں نے ہندوستانیوں کے داخلہ کے خلاف سخت امتناعی قوانین جاری کر رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مہاجرین کی تعداد بہت کم ہے اور ہندوستان کی بڑھی ہوئی آبادی کو ہجرت سے بہت کم فائدہ پہنچنے کی امید رکھنا چاہیئے۔

آبادی کے کم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نئی اولاد پیدا کرنا کم کیا جائے۔ بلاشبہ یہی طریقہ ہندوستانیوں کے لئے اس وقت سب سے زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہندوستانی اپنی شرح پیدائش کو کم نہیں کریں گے تو اوپر لکھے ہوئے سب علاجوں کو اختیار کرنے کے باوجود کوئی بہتر نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ ہندوستان کی آبادی میں ہر دسویں سال جزائر برطانیہ کی مجموعی آبادی کے برابر محض اضافہ ہو جاتا ہے یہ یقیناً ایک نہایت تشویش ناک امر ہے۔ ترقی کی یہی رفتار قائم رہی تو چاہے ہم ملک کے چپہ چپہ پر انگلستان، جرمنی اور جاپان کی طرح صنعتیں کیوں نہ قائم کر دیں اور زراعت کو چاہے کیسی ہی ترقی کیوں نہ دیں ہماری حالت کبھی بہتر نہ ہو سکے گی۔ اس لئے اولاد کی پیدائش کو گھٹانا ایک لازمی اور قطعی فرض ہو گیا ہے۔ لیکن اس بات کا عام احساس پیدا کرنا اور لوگوں کے تعصبات اور رسم و رواج کا مقابلہ کرنا بہت دشوار کام ہے۔ پھر ضبط نفس کے علاوہ جو دوسرے مانع اولاد طریقے تبلائے جاتے ہیں ان کے خلاف مذہبی معتقدات کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ پھر مالی اعتبار سے بھی یہ طریقے غریبوں کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ان سے آبادی میں کسی فوری کمی کی توقع کرنا مناسب نہیں ہے لیکن ضبط نفس کی تعلیم کو جہاں تک مذہب اور اخلاقیات کی حدود میں رہتے ہوئے ممکن ہو پھیلانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ لوگوں میں پیش بینی اور عاقبت اندیشی کے جذبہ کو پیدا کرنا چاہیئے۔ شادی کی عمر کو بڑھا دینا چاہیئے بچے کو دودھ پلانے کی مدت کو طویل کر دینا چاہیئے۔ دل بہلانے کے دوسرے مشغلوں مثلاً مطالعہ کتب اور فنون لطیفہ سے رغبت پیدا کرانا چاہیئے غریبوں اور بے کسوں کی امداد، خدمت خلق کے اور دوسرے کاموں، روزہ اور نماز کی طرف بھی لوگوں کو مائل کرنا چاہیئے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ۔

اس کے بعد آخری طریقہ ملک میں صنعتوں کو ترقی دینے کا رہ جاتا ہے۔ اس میں جو گنجائش ہے اس کے بارے میں ہندوستان کے مفکروں اور معاشیات کے ماہروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہندوستان

یں صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بہت سی قدرتی سہولتیں موجود ہیں۔ مصنوعہ مال کے لئے اچھے گاہک آج بھی موجود ہیں جو باہر کے مال کو خرید کر اپنی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو ان خریداروں کو ملکی مال کا گاہک بنایا جاسکتا ہے اور دوسری طرف جب یہاں کی کثیر آبادی کو روزگار سے لگایا جائے گا اور ان کی قوت خرید کو بڑھایا جائے گا تو خریداروں کی تعداد اور بھی زیادہ بڑھ جائے گی۔ خریداروں کی اس ترقی سے ملکی صنعتیں خوب ترقی پائیں گی اور روزگار اور قوت خرید میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔

لیکن صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے بڑے سرمایہ، باہمہارت مزدوروں، منتظموں اور حکومت کی اعانت اور مربیانہ سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک یہ سہولتیں فراہم نہیں ہوں گی، صنعتی ترقی کی رفتار بہت سست رہے گی۔ اس کے علاوہ اور دوسرے سوالات بھی ہیں جو اس سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو شروع کیا جائے گا یا اوسط اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو۔ بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں مزدوروں کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے زیادہ تر کام مشینیں ہی انجام دیتی ہیں۔ اس لئے اگر بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو شروع کیا گیا تو ان کے ذریعہ سے ہندوستان کی موجودہ کثیر آبادی کے بہت کم حصہ کے لئے روزگار نکل سکے گا۔ اس وقت بڑے پیمانہ کی منظم صنعتوں میں ہندوستان کی آبادی کا صرف ایک فی صدی حصہ لگا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کا شمار دنیا کے بڑے صنعتی ملکوں میں آٹھویں درجہ پر ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان میں منظم اور بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے ترقی پا جانے سے یہاں کی پیداوار آج کے مقابلے میں دوگنی ہوگئی (جو ترقی کی خاصی تیز رفتار ہوگی) تو اس سے زیادہ سے زیادہ تقریباً ایک فی صدی آبادی کے لئے اور روزگار فراہم ہو سکے گا۔ لیکن ہندوستان میں آبادی کے محض اضافہ کی رفتار ایک فی صدی سالانہ ہے۔ اس لئے اگر آبادی کا موجودہ اضافہ جاری رہا تو ہمیں ہر سال ان کے لئے روزگار فراہم کرنے کے واسطے اپنی موجودہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے برابر نئی صنعتیں کھولنا ہوں گی۔ لیکن بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی کو اسی وقت تک جاری رکھا جاسکتا ہے جب ان کے بنائے ہوئے مال کے لئے ایک وسیع منڈی موجود ہو۔ اگر کچے مال اور معدنیات کی رسد کے محدود ہونے کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو صنعتی ترقی کی اس رفتار کے لئے جس کو بحث کی خاطر ہمیں نے اوپر فرض کر لیا ہے ایک ایسی وسیع منڈی کی ضرورت ہوگی جس کے لئے ایک دنیا تو کیا ہماری جیسی کئی دنیائیں

بھی ناکافی ہوں گی۔ ہمارا ملک بہت بڑا ہے لیکن پھر بھی صنعتی ترقی کی اس رفتار کا حریف ہونا غالباً اس کے لئے دشوار ثابت ہوگا اور موجودہ حالات میں جب کہ ہر ملک خود کفالتی نظام کے چکر میں ہے ہمیں اپنے آپ کو ملکی منڈی تک ہی محدود رکھنا ہوگا۔

اس سے قطع نظر بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی سے چھوٹی صنعتوں کو نقصان پہنچتا ہے اور جتنے آدمیوں کو روزگار بڑی صنعتوں میں ملتا ہے اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ آدمی چھوٹی صنعتوں کے ختم ہوجانے کی وجہ سے روزگار سے محروم ہوجاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں کی ترقی سے بہت سی بنیادی اور ضمنی صنعتوں کو ترقی دینا بھی ضروری ہوجاتا ہے لیکن بصورت مجموعی آبادی کے لئے روزگار میں بہت زیادہ اضافہ کی امید رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔

پھر ان غیر ملکی صنعتوں کو جن کا مال اس وقت ہندوستان میں فروخت ہوتا ہے۔ ملکی صنعتوں کی ترقی سے جو نقصان پہنچے گا اس کے اثرات بھی ناگوار صورت اختیار کرسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان ملکوں میں ہماری پیداوار کی موجودہ برآمد بند ہوجائے اور ہمارے ملک کے کسانوں اور کچا مال پیدا کرنے والوں کو جو فائدے اب حاصل ہوتے ہیں نہ ہوسکیں۔ ملکی صنعتوں کی ترقی سے ان کے مال کے لئے ملکی طلب ضرور پیدا ہوگی لیکن وہ شاید ان کے نقصان کی تلافی نہ کرسکے۔ اس کے علاوہ اس کے سیاسی نتائج بھی خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ جن ملکوں کی صنعتوں کو ہماری ملکی صنعتوں کی ترقی سے نقصان پہنچے گا ممکن ہے وہ زور اور زبردستی، فتنہ انگیزی اور فساد کے ذریعہ ہماری صنعتی ترقی کو روکنا چاہیں۔ بہر حال جہاں بڑے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کے فائدے ہیں وہاں اس کی ان نقصانوں اور خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور روزگار مہیا کرنے کی جو اہلیت ان میں پائی جاتی ہے اس کے محدود ہونے کا تو ہمیں شروع سے ہی اعتراف کرلینا چاہیئے۔

لیکن ہوسکتا ہے کہ صنعتوں کی ترقی کے ساتھ علمی پیشوں اور دوسری خدمتوں کے لئے ہمارے ملک میں زیادہ گنجائش نکل آئے اور گھریلو اور چھوٹی صنعتیں بھی آرائش وزیبائش اور فنون لطیفہ کے سلسلہ میں جاری رہ سکیں، زراعت اور اس کے ضمنی اور متحدہ پیشوں کو بھی ہم خوب ترقی دے لیں اور ہماری غیر ملکی

تجارت میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہو۔ ہم بہت سی مصنوعہ یا نیم مصنوعہ چیزیں باہر کے ملکوں سے بھی منگانا جاری رکھیں۔ اگر ایسا ہوا تو اس سے سب طبقوں کی خوش حالی میں عام طور پر اضافہ ہوگا اور لوگوں کی آمدنیوں کے ساتھ غذا کی زیادہ مقداریں خود اپنے ملک کے اندر اور باہر کے ملکوں سے خریدی جا سکیں گی۔

چوتھا اور آخری علاج میں نے یہ بتلایا تھا کہ ان سب علاجوں کو جمع کر دیا جائے اور سب کو ایک ہی وقت میں اختیار کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ اتنا اہم اور تشویشناک ہو گیا ہے کہ اس کے لئے کوئی ایک واحد علاج اب کافی نہیں ہو سکتا۔ مختلف مورچوں سے اس پر حملہ کرنے کی ضرورت ہے جب ہی اس کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کی امید کی جا سکتی ہے۔

کیا مزدوروں کی معاشیات سرمایہ داروں کی معاشیات سے مختلف ہے؟

(ذیل میں ہم ایک نہایت اہم اور دلچسپ بحث کی ابتدا کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ معاشیات کے وہ اصول جو ملکیت ذاتی، مقابلہ اور آزادیٔ کاروبار کی مفروضہ بنیادوں پر تعمیر کئے گئے تھے، سرمایہ دارانہ معیشت کے علاوہ اور دوسری قسم کی معیشتوں پر بھی منطبق کئے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ آجر کے نفع کی جگہ مزدور کے مفاد کو، نفع کی جگہ رفع احتیاجات کو اگر معاشیات کا مرکز بنایا جائے تو آیا اس صورت میں اسی طرح کا معاشیات کا علم تعمیر ہوگا جیسا راسخ العقیدہ ماہرین معاشیات پیش کرتے ہیں یا نتیجہ اس سے کچھ مختلف برآمد ہوگا۔ ہم معاشیات کے اصول سے دلچسپی رکھنے والے بزرگوں کو ایک عام دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس موضوع پر جامعہ کے صفحات میں اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار فرمائیں۔ مدیر)

معاشیات ایک اجتماعی علم ہے یعنی یہ بے جان فطرت یا نباتی اور حیوانی دنیا یا تنہا انسانوں کی زندگی کے مظاہر سے بحث نہیں کرتا بلکہ ان تعلقات سے بحث کرتا ہے جو انسانوں کے درمیان جماعت میں باہم مل کر رہنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

جماعتی تعلقات کی وابستگیاں کتنی اہم ہوتی ہیں یہ ہر شخص جانتا ہے۔ انسان کے ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں بھی انسان کے بارے میں جماعت سے الگ رہنے کا تخیل قائم کرنا ممکن نہیں ہے۔ انسان کے متعلق یہ ٹھیک کہا گیا ہے کہ وہ جماعتی حیوان ہے۔

لیکن انسان کے جماعتی تعلقات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک طرف خاندانی تعلقات ہوتے ہیں۔ پھر ایسے سیاسی تعلقات ہوتے ہیں جو مختلف جماعتوں اور طبقوں کی کشمکش سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ایسے تعلقات ہوتے ہیں جو آدمیوں کے تمدنی میل جول سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام تعلقات سے علم المعیشت میں بحث نہیں کی جاتی۔ اس کے مطالعہ کا دائرہ بہت محدود ہے۔ یہ صرف ایسے جماعتی تعلقات کا مطالعہ کرتا ہے

جو آدمیوں میں جماعتی پیداوار کے پیدا اور تقسیم کرنے کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں اور ... دولت آفرینی کے تعلقات کہا جاتا ہے۔

جس طرح آدمیوں کا جماعت سے باہر تصور کرنا ناممکن ہے ایسے ہی کسی ایسے شخص کا تصور بھی ناممکن ہے جو جماعت میں رہتے ہوئے دوسرے آدمیوں سے دولت آفرینی کے تعلقات نہ رکھتا ہو۔ ان حالتوں میں بھی جب لوگ براہ راست پیدائش دولت میں کوئی حصہ نہیں لیتے، یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ ان میں دولت آفرینی کے کوئی تعلقات (اگر دولت آفرینی کو اس کے وسیع مفہوم میں استعمال کیا جائے) نہیں ہیں۔ کیونکہ ہر شخص کو کھانا، پینا، پہننا یا کسی نہ کسی دوسری شکل میں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنا ہوتا ہے اور جس حد تک یہ کرنا پڑتا ہے اس حد تک دولت آفرینی کے تعلقات بھی ان لوگوں سے پیدا کرنے پڑتے ہیں جو اپنی محنت سے اس کو اپنی ضرورتیں پورا کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ذرایع دولت آفرینی (زمین فیکٹری اور ورکشاپ) پر قبضہ کرکے ایک آدمی بغیر محنت کئے زندہ رہ سکے لیکن دوسرے آدمیوں کی محنت کی موجودگی اور دولت کی پیدائش اور تقسیم کے تعلقات پیدا کئے بغیر آدمی کا زندہ رہنا قطعاً ناممکن ہے۔

لیکن کیا علم المعیشت دولت آفرینی کے جتنے تعلقات لوگوں کے درمیان پیدا ہوتے ہیں ان سب کا مطالعہ کرتی ہے؟

مثال کے طور پر قدرتی معیشت یا خاندانی زرعی معیشت کو لیجئے جس میں اپنی ساری ضرورتوں کو خود اپنے حلقہ میں محدود رہ کر پورا کیا جاسکتا ہے اور جس میں دوسری معیشتوں سے تعلقات پیدا نہیں کئے جاتے یہاں دولت آفرینی کے تعلقات کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے۔ اس میں محنت کی مشترکہ تنظیم اس طرح پر کی جاتی ہے کہ اس سے عورتوں، مردوں، بالغوں اور بچوں میں ایک طرح کی تقسیم عمل تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن سب خاندان کے مکھیا کی مرضی کے پابند ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں تعلقات میں تنظیم خاندان کے بزرگ کی شعوری منشا، اور مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنے خاندان کی ضرورتوں کا تخمینہ کرتا ہے پھر اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے کہ زمین کے کتنے حصہ میں جوار، باجرا بونا چاہیئے کتنے میں مکہ، گیہوں وغیرہ وغیرہ۔ پھر یہ تعلقات اتنے سہل اور آسان ہوتے ہیں کہ ان کے لئے کسی خاص مطالعہ یا علم بنانے کی ضرورت

نہیں ہوتی۔

اسی طرح ایک کمیونسٹ جماعت کو لیجئے جس کی بنیاد سوویٹ یونین میں پڑ رہی ہے۔ ایسی جماعت میں تمام اراکین اپنی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے مشترکہ طور پر محنت کرکے اپنے آپ کو مصروف رکھیں گے اور ان کی یہ مصروفیت ایک منصوبہ کی پابند ہوگی اور اس کی تشکیل وہ ادارہ کرے گا جو اس معاشی اتحاد کی مشترکہ مرضی کا اظہار کرے گا۔ یہ ادارہ پہلے کمیونسٹ سوسائٹی کی ضرورتوں کا تخمینہ کرے گا اور اس تخمینہ کی بنیاد پر معیشت کے مختلف شعبوں اور کاروبار کی مختلف شاخوں میں محنت کو تقسیم کرے گا۔ اوزاروں اور اشیاء خام کو بھی بلا کسی مبادلہ یا خرید و فروخت کے منصوبہ کے مطابق ہی تقسیم کیا جائے گا اسی طرح نیم مصنوعہ اشیاء بھی منصوبہ کے مطابق ان کارخانوں میں بھیجی جائیں گی جو انہیں مصنوعہ شکل دیتے ہیں۔ مصنوعہ شکل حاصل کرنے کے بعد وہ سرکاری گوداموں میں پہنچ جائیں گی اور سوسائٹی کے تمام کارکنوں کے درمیان ان کی احتیاجات کے مطابق تقسیم کردی جائیں گی۔ اسی طرح جماعتی تنظیم اور اس کی شعوری نگرانی کے ذریعہ انسانوں کی ضرورتوں اور ان کی پیدائش دولت میں منصوبہ کے ماتحت مطابقت پیدا ہو جائے گی۔

یوں تو زرعی قدرتی معیشت اور کمیونسٹ معیشت میں بہت زبردست اختلاف ہے لیکن ایک بات ایسی ہے جس میں یہ دونوں مشترک ہیں اور وہ یہ ہے کہ دونوں کی تنظیم اور نگرانی شعوری انسانی مرضی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

اب اس کے مقابلہ میں جدید سرمایہ کی معیشت کو لیجئے یہ تمام انفرادی نجی کاروباروں کا مجموعہ ہوتی ہے اور موجودہ سرمایہ دار ملکوں میں بڑے بڑے سرمایہ کے کاروبار کے ساتھ ساتھ جس میں ہزاروں مزدور ملازم رکھے جاتے ہیں بے شمار چھوٹے چھوٹے کاروبار ملتے ہیں جن میں لاکھوں کاریگر اور کروڑوں کسان نجی طور پر کام کرتے رہتے ہیں۔ ان بے شمار چھوٹے بڑے کاروبار کی نگرانی کسی ایک واحد شعوری مرضی کے مطابق نہیں ہوتی ان کا کوئی نگرانی کرنے والا مرکز نہیں ہوتا جو پہلے سے انسانی ضرورتوں کا اندازہ کرے اور پیدائش کے مختلف شعبوں میں ان ضرورتوں کے مطابق محنت کو تقسیم کرے۔ ہر انفرادی آجر اندھا دھند کام کرتا ہے۔ اسے اس بات کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا کہ جن اشیا کو وہ پیدا کر رہا

ہے ان کی کتنی طلب ہو گی یا یہ کہ اس کے علاوہ اور کتنے آدمی اسی چیز کے پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں وہ سب سے بے تعلق ہو کر صرف اپنے نجی مفاد کو سوچتا ہے اور جماعت کے مجموعی مفاد کی اسے بالکل پرواہ نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ من مانا نظام پیدا ہوتا ہے جسے سرمایہ دارانہ جماعت کے مزاج سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

اس قسم کی مزاجی جماعت کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ ایسی جماعت میں انسانی ضرورتوں اور پیدائش دولت میں توازن کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام جماعت میں ان غیر منظم تعلقات کی نگرانی کچھ قوانین کے ذریعہ ضرور ہوتی ہے لیکن ان قوانین کا عمل اندھا دھند طریقہ پر ہوتا ہے۔ اس میں معاشی کام میں شریک ہونے والوں کی مرضی اور شعوری جدوجہد کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ اس میں اور منظم جماعت میں (دہ کسانوں کی خاندانی جماعت ہو چاہے مستقبل کی کمیونسٹ جماعت) نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ علم المعیشت میں ان ابتدائی قوانین سے بحث کی جاتی ہے جو سرمایہ دارانہ معیشت میں دولت آفرینی کے تعلقات کی نگرانی کرتے ہیں۔

جہاں تک کافی بالذات اور کمیونسٹ معیشت میں شعوری انسانی مرضی کا دخل ہے ان کے مظاہر میں ہم کو علم المعیشت کے مطالعہ کے لئے مواد نہیں مل سکتا۔ کمیونسٹ سوسائٹی کے دولت آفرینی کے تعلقات کے لئے جو ابتدائی فطری معیشت سے یقیناً بہت زیادہ پیچیدہ ہوں گے غالباً ایک خاص علم کی ضرورت ہوگی لیکن وہ علم معیشت کا علم نہیں ہوگا۔

سرمایہ دارانہ معیشت کے ساتھ سوویٹ معیشت کے قوانین کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سوویٹ معیشت کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ یہ حالت ارتقا میں ہے۔ اس میں منصوبہ والی اور مزاجی دونوں خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں سادہ اشیائی تعلقات سے لے کر نجی سرمایہ دارانہ تعلقات تک سب قسم کی چیزیں ملتی ہیں۔ ان عناصر کی وجہ سے ہمارے سامنے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں مثلاً سوویٹ معیشت میں سرمایہ دارانہ معیشت کے قوانین کا ابھی تک کتنا عمل دخل موجود ہے منصوبہ والی اور مزاجی صنعت میں وہاں کس قسم کے تعلقات پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کی نسبتی اہمیت کیا

ہے۔ ان کے ارتقا کا کیا رجحان ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مسائل میں نہ صرف بہت زیادہ نظری دلچسپی پائی جاتی ہے بلکہ ان میں سے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق سوویٹ مملکت کے بعض معرکتہ الآرا مسائل سے ہے۔ اس مطالعہ سے ہمیں نہ صرف ارتقائی اور درمیانی دور کے قوانین کا علم حاصل ہوگا بلکہ جماعتی تعمیر کے کام میں بھی ہم شعوری طور پر حصہ لے سکیں گے۔ اس کے برعکس سوویٹ معیشت اور سرمایہ دارانہ معیشت کے مقابلہ سے ہمیں علم المعیشت کے بنیادی تخیلات کے سمجھنے میں بھی بہت مدد ملے گی۔

آخر میں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ علم المعیشت سرمایہ دارانہ جماعت کے نہایت اہم مفادوں سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کے تمام نظری نتائج اور مفروضات میں طبقہ دارانہ ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ ہمیں علم المعیشت کو مزدوروں کے طبقہ کے نقطۂ نگاہ سے بھی مطالعہ کرکے دیکھنا چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہمیں واقعات کو اپنے حسب دلخواہ توڑ مروڑ کر پیش کرنا چاہئے۔ سرمایہ داری کا ارتقا ناگزیر طریقہ پر ہمیں مزدور طبقہ کی فتحمندی کی طرف لے جارہا ہے۔ اس کا بہترین ثبوت مزدور طبقہ کی روس میں فتح ہے۔ اس لئے مزدوروں کے طبقہ کو خالی الذہن ہوکر معروضی طریقہ پر سرمایہ دارانہ جماعت کے ارتقا کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس ارتقا کے قوانین کے مطالعہ کے بعد مزدوروں کا طبقہ اپنی پالیسی اور جنگ کے طریقوں کو بہتر طریقہ پر تنظیم دے سکے گا اور کمیونسٹ سوسائٹی کے پیدا ہونے میں جن مصائب اور تکالیف کا اب سامنا کرنا پڑرہا ہے انھیں کم کرسکے گا۔ پرولتاریہ کے مفاد اگرچہ برسرِاقتدار سرمایہ دار جماعت سے بنیادی طور پر مختلف ہیں لیکن جہاں تک معاشرتی ارتقا اور کل انسانیت کے مفاد کا تعلق ہے وہ اس سے بالکل ہم آہنگ ہیں۔

دنیا کے مختلف اور تغیر پذیر تمدن

دنیا کے مختلف علاقوں میں لوگوں کے طرز زندگی میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ ان کے مکانات، ان کے لباس، ان کے مراسم، ان کی حکومتیں اور ان کی تفریحیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں یعنی ان مختلف علاقوں کا تمدن ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ یورپ کے علاقہ کا تمدن ایک قسم کا ہے تو ایشیا کا دوسرے قسم کا۔ اسی طرح شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے تمدن اور طرح کے ہیں۔ افریقہ کا اور بھی مختلف ہے۔

ان بڑے علاقوں کے علیحدہ علیحدہ ملکوں کو اگر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا تمدن و معاشرت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ فرانسیسی تمدن جرمنوں کے تمدن سے یا اسپین، اٹلی یا سوویت یونین کے تمدن سے مختلف ہے۔ حالانکہ ان سب ملکوں کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایشیا میں چینی اور جاپانی جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں ان کی معاشرت بہت مختلف ہے۔ ہر ملک کی زبانیں مختلف ہوتی ہیں۔ کھانا پکانے اور مکان بنانے کا انداز مختلف ہوتا ہے اور تفریحوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہر ملک کا تمدن مختلف ہے۔

دنیا کے لوگوں کے تمدن میں یوں تو بہت سے اختلافات ہیں لیکن اگر ان کے فرق کو دو عنوانوں کے ماتحت دیکھا جائے تو صورت حال کے سمجھنے میں بہت مدد ملے گی یعنی (۱) صنعتی تمدن اور (۲) زراعتی تمدن۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ صنعتی تمدن کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر شہروں میں رہتے ہیں۔ قوت محرکہ سے چلنے والی مشینوں سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں۔ سامان کو اٹھانے اور منتقل کرنے کے لئے بھی مشینوں کا استعمال کرتے ہیں اور خبر رسانی کے لئے بجلی کا۔ دستکاری تقریباً بالکل غائب ہوگئی ہے یہاں تک کہ کھیتی کا کام بھی مشینوں کی مدد سے ہی کیا جاتا ہے۔

لیکن کرۂ زمین کے دوسرے حصوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے تمدن کو زراعتی کہا جاتا ہے۔

یہ گاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کے یہاں فیکٹریاں بہت کم ہوتی ہیں انجن اور مشین تقریباً بالکل نہیں ہوتے۔ انسانوں یا جانوروں کے ہاتھ پاؤں یا ہوا اور پانی کی چکیوں کی مدد سے یہ اپنے سب کام کرتے ہیں باہر کے لوگوں سے یہ بہت کم تجارت کرتے ہیں اور ریلوں یا موٹروں سے تقریباً ناواقف ہوتے ہیں۔

غرضکہ تمدن کی یہ دو خاص قسمیں ہیں۔ دنیا کی ایک ارب نوے کروڑ آبادی ستر ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے ان سب ملکوں کا مطالعہ کرنا تو مشکل ہے۔ البتہ ان ملکوں میں سے چند کو منتخب کرکے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کن میں زراعتی تمدن پایا جاتا ہے اور کن میں صنعتی تمدن۔ کون سے ملک زراعتی تمدن کو چھوڑ کر صنعتی تمدن کو اختیار کر چکے ہیں اور کون سے اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک بھی ایک حالت پر قائم نہیں ہے۔ تبدیلی کا سلسلہ برابر جاری ہے اس لئے ہمیں مطالعہ کرتے وقت اس مستقل تبدیلی کو اپنے سامنے رکھنا ہوگا۔

ہم گیارہ ملکوں کا مطالعہ کریں گے جن کو مندرجہ ذیل عنوانات کے ماتحت جمع کیا جا سکتا ہے۔

I امریکہ اور یورپ کے طاقتور صنعتی ممالک

(۱) برطانیہ عظمیٰ

(۲) فرانس

(۳) جرمنی

(۴) ریاست ہائے متحدہ امریکہ

یورپ کا ایک تغیر پذیر زراعتی ملک

(۱) روس

III ایشیا کا ایک ایسا ملک جو نہایت تیزی سے صنعتی ملک بن رہا ہے

(۱) جاپان

IV ایشیا کے تغیر پذیر زراعتی ممالک

ہندوستان

چین

V جنوبی امریکہ کے تغیر پذیر زراعتی ممالک

(۱) ارجنٹائن

(۲) برازیل

(۳) چلی

ہم نے ان گیارہ ملکوں کو تین وجوہ کی بنا پر مطالعہ کے لئے منتخب کیا ہے :-

(۱) ان کی مجموعی آبادی ایک ارب ساڑھے بائیس کروڑ ہوئی تو یعنی کرۂ زمین کی کل آبادی کی تقریباً دو تہائی ان کے رہنے سہنے کے طریقوں سے واقفیت کے معنی یہ ہیں کہ کرۂ زمین کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصہ کی معاشرت کا حال معلوم ہو گیا۔

(۲) ان گیارہ ملکوں میں دنیا کی خاص خاص نسلوں اور خاص خاص تمدنوں کے تقریباً سب ہی لوگ شامل ہیں ان کی مناسب نمائندگی ان کے ذریعہ سے ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کے مطالعہ سے ہمارے لئے کل کرۂ زمین کے تمدن کا مطالعہ کرنا ممکن ہو سکے گا۔

مثلاً برطانیہ عظمیٰ، فرانس، جرمنی اور ریاست ہائے امریکہ دنیا کی چار بڑی صنعتی قومیں ہیں۔ جس طرح ان ملکوں میں صنعتی طرز معاشرت کو گذشتہ زمانے میں ترقی حاصل ہوئی ہے اس سے اس بات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے دوسرے حصوں میں موجودہ زمانہ میں کس طرح صنعتی طرز معاشرت کی ترقی ہو رہی ہے۔ اس لئے ان چار ملکوں کو صنعتی ملکوں کا نمائندہ سمجھنا ٹھیک ہے۔

اسی طرح روس کے ذریعہ مشرقی اور وسطی یورپ کی ایک بہت بڑی آبادی کی زندگی میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے مشرقی ملکوں کی زندگی کا اندازہ چین اور ہندوستان کے زراعتی تمدنوں کا مطالعہ کر کے کیا جا سکتا ہے۔

(۳) تیسری وجہ ان کے منتخب کرنے کی یہ ہے کہ ان گیارہ ملکوں کو ہمارے زمانہ میں نہایت اہمیت حاصل ہے اور آئندہ رہنے کی امید ہے۔ ان کے رقبہ کی وسعت، ان کی آبادی کی کثرت اور ان کے قوت محرکہ کے ذرائع اور وسائل کی روز افزوں ترقی ان سب باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو دنیا کے اور تمام دوسرے

ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور رہے گی چنانچہ برطانیہ عظمیٰ، فرانس، جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یورپ کے طرز معاشرت کو دنیا پر پھیلانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ روس کے قبضہ میں دنیا کی ایک بہت کثیر آبادی ہے اور اس کا علاقہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان چین اور جاپان بھی جدید دنیا سے اب تک الگ تھلگ تھے اب اس کے معاملات میں بہت اہم حصہ لینے لگے ہیں اور جنوبی ارجنٹائن، برازیل اور چلی امریکہ کے جنوبی براعظم کے نہایت ممتاز ممالک ہیں۔ ان میں گذشتہ چند سالوں میں اس قدر تیزی کے ساتھ تبدیلی ہوئی ہے کہ اب وہ تمام دنیا کے لئے بہت بڑی مقداروں میں غذا فروخت کرنے لگے ہیں۔

یہ گیارہ ملک ایسے ہیں جن سے ہمیں آئندہ بہت زیادہ واسطہ پڑے گا۔ اس لئے ان کے تمدن کو سمجھنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے۔

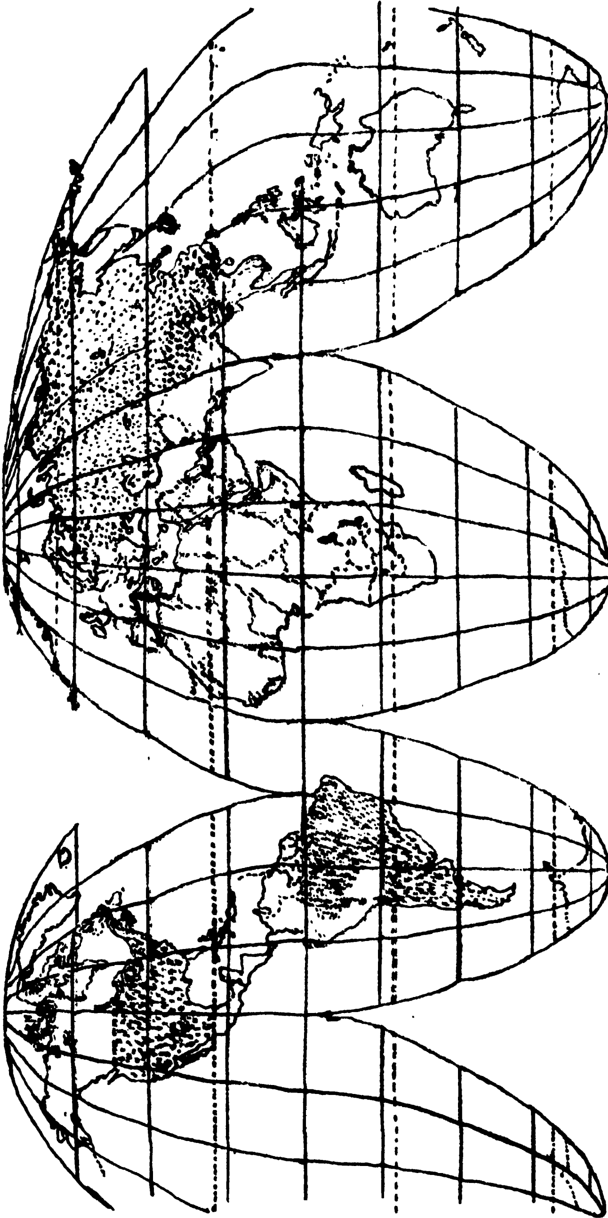
دنیائے جدید کے ان تغیر پذیر تمدنوں کو سمجھنے کے واسطے ان کی تاریخ کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ ابتدائی زمانہ میں ان کی کیا حالت تھی۔ کون سے اثرات تھے جن کی وجہ سے ان میں تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوا اور ان کی موجودہ خصوصیات کیا ہیں۔ یہ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ آج کرۂ زمین پر جہاں کہیں بھی لوگ آباد ہیں ان کی معاشرت میں تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے۔ مغربی یورپ کے ملک گذشتہ سو سالوں سے زراعتی تمدن کو چھوڑ کر صنعتی تمدن اختیار کر رہے ہیں اور اب کچھ سالوں سے مشرقی یورپ، جنوبی افریقہ، اور جنوبی امریکہ کے لوگ بھی صنعتی تمدن کو اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح مشرق بعید اور ہندوستان میں کام کرنے کے طریقوں، نقل و حمل اور خبر رسانی کے وسائل اور معاشری زندگی میں نہایت تیزی کے ساتھ تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ اس لئے ان تمدنوں کی تاریخ کا مطالعہ جس سے مختلف زمانوں میں ان کے طرز معاشرت کا باہمی مقابلہ کیا جا سکے نہایت ضروری ہے۔

اس مطالعہ کو زیادہ مناسب طریقہ پر اس طرح شروع کیا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں عہد وسطیٰ کی زندگی کا ایک عام خاکہ پیش کر دیا جائے یعنی یہ بتلایا جائے کہ صنعتی انقلاب سے پہلے یورپ اور ایشیا میں عام طور پر کیا صورت حال تھی پھر اس کے بعد الگ الگ ملکوں کو لے کر یہ دیکھا جائے کہ ۱۷۵۰ء کے بعد سے کس طرح انھوں

نے زراعتی تمدن کو چھوڑ کر صنعتی تمدن کو اختیار کیا اور آج بھی اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

(باقی آئندہ)

(نوٹ، ذیل کے نقشہ میں دنیا کے ان ملکوں کو جن کے بارے میں حالات بیان کئے جائیں گے نقطے لگا کر ظاہر کیا گیا ہے۔



پبلک زندگی کی اخلاقی صفات

(از جناب محمد عاقل صاحب)

ہر شخص کو دنیا میں دو طرح کی زندگیاں بسر کرنی پڑتی ہیں۔ ایک اس کی نجی یا پرائیویٹ زندگی ہوتی ہے اور دوسری اس کی عام یا پبلک زندگی۔ نجی زندگی کا تعلق اس کی خاص اپنی ذات سے قریب کے دوستوں اور رشتہ داروں سے ہوتا ہے اور باہر کے لوگ اس سے واقف نہیں ہوتے لیکن پبلک زندگی پر سب لوگوں کی نظر ہوتی ہے اور اس کا اثر سب لوگوں پر پڑتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی نجی زندگی میں بہت سچا، نیک اور دوسروں کے لئے قربانی کرنے والا ہو۔ اپنے ماں باپ، بیوی بچوں، عزیز اور دوستوں کے حقوق کو نہایت اچھائی کے ساتھ پورا کرتا ہو۔ لیکن اس کی پبلک زندگی گندی اور ناپاک ہو۔ پبلک زندگی کے فرائض کو وہ ٹھیک طرح سے انجام نہ دیتا ہو اس کی محبت اور وفاداری صرف چند لوگوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہو۔ خاندانی کشش، قبیلے، فرقے اور جماعت کی محبت نے اسے متعصب اور جانب دار بنا دیا ہو۔ صرف اپنے چھوٹے حلقہ کے فرائض، ایمانداری سے پورا کرنا، وہ ضروری سمجھتا ہو اور باقی سب لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ دشمنوں جیسا ہو۔ ان کو لوٹنے مارنے، ان کو نقصان پہنچانے، ان کو دھوکہ فریب دینے کے لئے وہ ہر وقت تیار رہتا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص نہایت ایثار اور قربانی سے کام کر رہا ہو۔ اپنی ذات کی بھلائی اس کے سامنے بالکل نہ ہو بلکہ صرف اپنے عزیزوں اور دوستوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے وہ ہر قسم کے چھل فریب، بے ایمانی اور دغابازی کا ارتکاب کر رہا ہو۔ ایسے شخص کا جرم سنگین تو نہیں رہے گا۔ لیکن پھر بھی وہ مجرم ہے۔ اس لئے کہ اس نے اعلیٰ وفاداری کے مقابلہ میں ادنیٰ وفاداری کو ترجیح دی۔ نجی فائدہ کے لئے پبلک فائدہ کو قربان کیا

"نجی فائدہ اور پبلک فائدہ" کے اس فرق کی طرف ہم ہندوستانیوں کو اس وقت خاص طور پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں پنچایتی حکومت قائم کرنے کا ہم فیصلہ کر چکے ہیں ہمیں اختیارات مل رہے

ہیں اور بہت جلد اور زیادہ اختیارات ملنے کی امید ہے۔ لیکن ہر حق کے ساتھ ایک فرض، ہر اختیار کے ساتھ ایک ذمہ داری پیدا ہوتی ہے۔ جو حقوق ہمیں ملے ہیں انھیں اپنے ذاتی اثرات دولت اور اقتدار کے بڑھانے کا ایک ذریعہ نہ بنانا چاہیے بلکہ کل قوم کے فائدے اور خدمت کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھنا چاہیے۔ بہت آسانی سے یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے یا اپنے دوستوں اور عزیزوں کے نفع کے لئے اپنے اختیارات کو استعمال کرنا شروع کردیں۔ لیکن یہ بات زیادہ دنوں تک نبھ نہیں سکتی ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم اگر ایسا کریں گے تو دوسرے بھی ایسا ہی کریں گے اور اگر سب نے یہی کیا تو کیسی افراتفری مچے گی۔ کیسا فساد برپا ہوگا۔ لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو جائیں گے اور پنچایتی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جو فرائض شہریوں پر عاید ہوتے ہیں انھیں ہم الگ الگ عنوانوں کے ماتحت آج بیان کرنا چاہتے ہیں پہلے ہم ووٹروں کو لے کر دیکھیں گے کہ ان کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ پھر ہم مجالس قانون ساز کے ممبروں کے فرائض کو لیں گے پھر سیاسی جماعتوں کے فرائض کا بیان کریں گے اس کے بعد جماعت عاملہ اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے فرائض کو دیکھا جائے گا۔ اور آخر میں ادنے عہدہ داروں کے جو پبلک فرائض ہیں ان کا بیان کیا جائے گا۔ جس ریاست کے سب شہری اپنے فرض کو پہچانتے ہیں اس کی خوش حالی اور پائداری یقینی ہے۔ اور جس ریاست کے شہریوں میں پبلک زندگی کی اخلاقی خوبیاں غائب ہیں اس کی بنیاد گویا ریت پر رکھی گئی ہے اور ایسی ریاست زیادہ دن قائم نہیں رہ سکتی۔

سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ ووٹروں کو اپنی پبلک زندگی میں کون سی اخلاقی صفات پیدا کرنی چاہییں، جن سے ان کا شمار اچھے شہریوں میں کیا جا سکے۔ ہر ووٹر کو اپنی رائے دینے کے حق کو ایک مقدس فرض سمجھنا چاہیے۔ اسے رشتہ داری، ذات، برادری، فرقہ، مذہب ان سب باتوں سے ہٹ کر یہ دیکھنا چاہیے کہ جس شخص کو میں ووٹ دے رہا ہوں۔ اس میں واقعی اس بات کی قابلیت ہے یا نہیں کہ وہ سب لوگوں کے مفاد کی صحیح نمائندگی مجلس قانون ساز میں کر سکے۔ کیا وہ منتخب ہونے کے بعد رعایا کے لئے اچھے قانون ان کی بھلائی کی اور بہتری کے لئے اچھی تجویزیں اور منصوبے سوچ سکے گا اور انھیں عملی جامہ پہنا سکے گا یا نہیں۔ اگر جواب 'ہاں' ہو تو اسے اس امیدوار کو ووٹ دینا چاہیے ورنہ ہرگز ووٹ نہ دینا چاہیے۔ اکثر ووٹروں کو دیکھا

گیا ہے کہ وہ اپنی ذات برادری یا مذہب کے لوگوں کو چاہے ان میں قابلیت ہو یا نہ ہو ووٹ دینا پسند کرتے ہیں پھر یہاں تک بھی غنیمت ہے بہت سے لوگ رشوت لے کر ووٹ دیتے ہیں یا زمیندار ساہوکار یا کسی بدمعاش غنڈے کی دھمکیوں سے ڈر کر بھیڑ بکری کی طرح ووٹ دینے کی جگہ جاتے ہیں اور دھمکی دینے والے جسے کہتے ہیں اسے ہی چپکے سے ووٹ دے کر لوٹ آتے ہیں۔ یہ بڑی سخت نادانی اور گمراہی ہے ایسا کرنے سے وہ اپنے پاؤں میں خود اپنے ہاتھ سے کلہاڑی مارتے ہیں۔ جو لوگ دھمکی اور لالچ دے کر ان کے ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں ظاہر ہے وہ ان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ ان سے بھلائی کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی وہ ضرور دھوکا دیں گے۔ اسی طرح پبلک معاملات میں نجی دوستی اور مروت بھی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ نالائق آدمی خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور اپنے دوستوں اور حامیوں کو بھی ذلیل کرتا ہے اس لئے ووٹ دیتے وقت عقل و تمیز سے کام لینا چاہیئے اور جس شخص کی طرف داری کے لئے دل گواہی دیتا ہو جس کی طرف سے ضمیر مطمئن ہو اسی کو ووٹ دینا چاہیئے۔ چاہے اس میں اپنے جان اور مال کا نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ جو لوگ امیدواری کے لئے کھڑے ہوتے ہیں وہ اکثر جانے بوجھے ہوتے ہیں ان کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی پچھلی زندگی میں پبلک کی خدمت کے کون کون سے کام کئے ہیں۔ یہ ایماندار اور سمجھ دار ہیں یا بے ایمان اور بے وقوف۔ اس لئے جان بوجھ کر غلط آدمی کی حمایت کرنا سخت فرض ناشناسی ہے۔ اس سے جہاں تک ہو بچنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

اس سلسلے میں ایک سوال پارٹی کا پیدا ہوتا ہے۔ مغرب کے تمام ملکوں میں سیاسی پارٹیاں بنی ہوئی ہیں اور رعایا کے تمام لوگ کسی نہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور پارٹی جس کو کہتی ہے اس کو ووٹ دیتے ہیں۔ کسی پارٹی میں شامل ہونے کے بعد تو اس پارٹی کا حکم ماننا فرض ہے۔ لیکن پارٹی میں شریک ہونے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیئے کہ پارٹی کے مقاصد کیا ہیں۔ آیا مقاصد ایسے ہیں کہ جن سے ملک اور قوم کا فائدہ ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر جو پارٹی کے لیڈر ہیں ان کا پچھلا کارڈ بھی دیکھنا چاہیئے کہ انھوں نے ملک اور قوم کی خاطر کیسی کیسی قربانیاں کی ہیں وہ لوگ سمجھ دار اور دور اندیش ہیں یا یوں ہی خواہ مخواہ کی شورش مچاتے ہیں۔ ان سب باتوں کا اطمینان کر لینے کے بعد پارٹی کے فیصلہ پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور جب تک

پارٹی کے ممبر ہیں جو پارٹی کہے ویسے ہی کرتے رہنا چاہیئے۔ اس میں فائدہ زیادہ اور نقصان کم ہے۔ کیونکہ پنچایتی نظام میں ہر آدمی اگر الگ الگ اپنی مرضی کے مطابق کام کرانا چاہتا ہے تو اس کے لئے کوئی کام کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن پارٹی بنانے سے بڑی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لئے پارٹیاں قائم کی جاتی ہیں۔ لیکن اس بات کی ہر شخص کو ہر وقت آزادی حاصل ہے کہ جب تک چاہے ایک پارٹی کا ممبر رہے اور جب چاہے اس سے علیحدہ ہو جائے اگرچہ اچھا آدمی تو وہی سمجھا جاتا ہے جو بات کو ایک دفعہ سوچ سمجھ کر طے کرے اور پھر اخیر وقت تک جب تک صورت حال واقعی ناقابل برداشت نہ ہو جائے اپنی بات پر اڑا رہے پھر دوسری بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ ووٹر کا کام امیدوار کو ووٹ دینے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنے چنے ہوئے ممبروں کے کام کی دیکھ بھال بھی کرتا رہے اور ان سے جواب طلب کرتا رہے جب کوئی ممبر اپنے فرض کو ٹھیک طرح پورا نہ کرے تو اس کے خلاف خوب پروپیگنڈا کرے اور آئندہ کے لئے اس کا چنا جانا ناممکن بنا دے۔ اگر ووٹر اپنے فرائض کو اس طرح پورا کریں تو ممبروں سے خوب اچھا کام لیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد دوسرا سوال مجالس قانون ساز کے ممبروں کے فرائض کا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ اپنے حلقہ کی ضرورتوں خواہشوں اور تمناؤں کا خوب غور سے مطالعہ کریں۔ اپنے ووٹروں کی بھلائی اور بہتری کی تجویزیں اور منصوبے سوچیں اور اس کے لئے قانون بنوائیں۔ لیکن ایسا کرتے وقت انھیں خود غرضی سے کام نہ لینا چاہیئے اپنے حلقے کی بھلائی کی اور بہتری کی خاطر دوسرے حلقہ کے لوگوں کی حق تلفی نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ایسے کام سوچنا چاہیئیں جس سے سارے ملک اور قوم کا فائدہ ہو۔ اگر کوئی ایسا موقع ہو جس میں اپنے حلقہ کا تو تھوڑا فائدہ ہوتا ہو لیکن اس تھوڑے فائدے کی خاطر سارے ملک کا بڑا نقصان ہو رہا ہو تو اس وقت ممبر کو دلیری اور ہمت کے ساتھ اپنے حلقہ کے فائدہ کو کل قوم کے فائدہ کے لئے قربان کر دینا چاہیئے۔ لیکن اکثر ممبر اپنے ان فرائض کو نہیں پہچانتے یا قصداً پورا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ووٹروں کو رشوت دے کر انھیں ڈرا اور دھمکا کر منتخب ہوتے ہیں اور چنے جانے کے بعد اپنی جیب گرم کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ جیسے انھوں نے دوسرے سے ووٹ خریدا تھا ایسے ہی یہ دوسرے کے ہاتھ ووٹ بیچنا چاہتے ہیں۔ جو ٹھیکیدار ساہوکار

یا کارخانہ دار انھیں روپیہ دیتے ہیں ان کے فائدہ کے لئے۔ قانون بنواتے ہیں ان کے ہاتھ میں بکے ہوئے ہوتے ہیں یا اگر حکومت اپنی طرف داری کے لئے ان کا ووٹ چاہتی ہے تو یہ اس کے بدلے میں اپنے عزیزوں رشتہ داروں کو ملازمت دلوانا چاہتے ہیں خود کمیٹیوں کے ممبر بننا اور بڑے بڑے بھتے کمانا چاہتے ہیں یا حکومت کے اثر سے اور سیکڑوں دوسرے فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے چننے والے حلقے کو خوش کرنے کے لئے کوئی ایسی بات کہتے اور کرتے ہیں جس سے ان کی واقعی خدمت یا کل قوم کی خدمت تو نہیں ہوتی لیکن اس حلقہ کے لوگوں میں جو ادنیٰ جذبات اور تعصبات پائے جاتے ہیں ان کی البتہ تسکین ہو جاتی ہے فرقہ وارانہ جذبات کو اور طبقہ وار کشمکش کو بھڑکانے والی تقریریں اور غیر ذمہ دار تنقیدوں سے یہ ووٹروں میں مقبولیت حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ کسی پارٹی کے وفادار نہیں ہوتے۔ ان کی ہر جائیوں جیسی مثال ہوتی ہے آج ایک پارٹی کا ساتھ دیا۔ جب دوسری پارٹی نے عہدے یا مالی فائدہ کا لالچ دیا تو دوسری پارٹی میں مل گئے۔ ایسے لوگ پبلک اور قوم کے بڑے دشمن ہیں اور ہرگز اس بات کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کو دوبارہ منتخب کر کے بھیجا جائے۔

اس کے بعد تیسری جگہ جہاں پنچایتی نظام کی کامیابی کے لیئے اخلاقی صفات کا ہونا ضروری ہے۔ وہ سیاسی پارٹی ہے دنیا کی تمام پنچایتی حکومتوں میں پارٹیاں بنی ہوئی ہیں اور ان پارٹیوں کے ذریعہ تمام کام چلائے جاتے ہیں۔ پارٹیاں اگر اصول کے مطابق بنیں۔ اگر وہ اپنا ایک پروگرام طے کرلیں کہ ہم کو عہدہ ملا تو ہم رعایا کے لئے یہ یہ بھلائی کے کام کریں گے تو یہ اپنا کام بہت خوبی کے ساتھ کرسکتی ہیں۔ اور عہدہ نہ ملنے کی حالت میں یہ نہایت ایمانداری اور معقولیت کے ساتھ حکومت کے کاموں پر تنقید بھی کرسکتی ہیں جس سے حکومت کی بہت سی یک طرفہ پالیسیوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر پارٹیاں کسی اصول کے مطابق نہ بنائی جائیں بلکہ چند سیاسی لیڈر سے اور بدمعاش یا بے ایمان زمیندار، سرمایہ دار اپنے نفع کی خاطر ان کے ڈھونگ کو قائم رکھیں اور بے وقوف ایمان دار لوگوں کو اپنے جال میں پھانسے رہنے کے لئے چالیں چلتے رہیں یا لالچ اور دھمکی سے لوگوں کو اپنا طرف دار بنائے رکھیں تو ایسی پارٹیاں رحمت کی جگہ لعنت اور خدائی قہر و عذاب بن جاتی ہیں۔ ان کی وجہ سے تمام ملک میں بے ایمانی، ریاکاری، فریب اور دغابازی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

کمزوروں اور بے وقوفوں کے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔ ملک کے اندر غلامی ترقی پاتی ہے۔ ملک کے باہر جنگ کے امکانات پیدا ہوتے ہیں دوسرے ملکوں کی آزادی چھینی جاتی ہے اور تمام دنیا ایک عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے یہ لوگ تمام مقدس جذبات کو اپنے ناپاک ارادوں کے پورا کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ خاندان کی محبت مذہب کی عقیدت وطن پرستی، انسانیت دوستی ان سب اعلیٰ جذبات کو وہ اپنے گندے مقاصد کا آلہ کار بناتے ہیں۔ مزدوروں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو فوج اور جنگ کے تباہ کرنے والے سامانوں کی خریداری پر صرف کرتے ہیں۔ لٹریچر، تاریخ، فلسفہ، سائنس کوئی چیز ان کے زہریلے اثر سے محفوظ نہیں رہتی اور دنیا بالکل دوزخ کا ایک نمونہ بن جاتی ہے۔ پارٹی کی ایسی تنظیم افراد کی آزادیوں اور حقوق کے لئے سخت مہلک ثابت ہوتی ہے۔ کسی شخص کو آزادی کے ساتھ رائے دینے کا موقع نہیں رہتا۔ اخبار، پلیٹ فارم سب پر پارٹی کا قبضہ ہوتا ہے اور پارٹی کا یہ ظلم سخت سے سخت مطلق العنان حکمرانوں کے ظلم سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ عوام کو چاہیئے کہ ایسی پارٹیوں کو کبھی نہ بننے دیں اور ابتدا میں ہی ختم کر ڈالیں اور اگر اتفاق سے یہ اقتدار حاصل کریں تو اپنی پوری اجتماعی قوت سے کام لے کر ان کو توڑ کر چکنا چور کردیں ان کی جگہ ایسی پارٹیاں بنائیں جو پارٹی ہونے کے باوجود کل ریاست بلکہ تمام انسانیت کے مفاد کو سب باتوں پر مقدم رکھیں۔ اپنے ملک و قوم کے مفاد کے خاطر دوسری قوموں کی جائز آزادیوں کو نہ چھینیں بلکہ جہاں کہیں مظلوم قومیں نظر آئیں ان کی آزادی اور خود مختاری تہذیب و ترقی کو اپنی زندگی کا ایک مقدس مشن بنالیں۔

پارٹی کے بیان کے سلسلہ میں ریاست کا دوسرا ادارہ جس میں خاص طور پر اخلاقی صفات ہونا ضروری ہیں وہ جماعت عاملہ اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار ہیں۔ ان پر حکومت کے تمام انتظام کا دارومدار ہوتا ہے۔ پالیسیاں چاہے کیسی ہی اچھی کیوں نہ مقرر کی جائیں لیکن اگر جماعت عاملہ اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں میں اپنے فرائض کا صحیح احساس اور وطن قوم اور انسانیت کی خدمت کا پورا جذبہ نہ ہوگا تو یہ پالیسیاں کبھی کامیاب اور سرسبز نہ ہوسکیں گی۔ اعلیٰ عہدہ داروں کی نیت میں سیری ہونا چاہیئے۔ جاہ وعزت اور مال و دولت کا ان کو بھوکا نہ ہونا چاہیئے۔ ان میں ایک ٹیم کی طرح مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہونا چاہیئے، ان میں حکم دینے اور حکم ماننے کی قابلیت ہونی چاہیئے۔ انھیں رشوت اور اس قسم کے تمام

غیر قانونی منافع سے بالاتر ہونا چاہیئے انہیں حکومت کے زمانے میں تجارت صنعت اور زراعت کے کاروبار سے اپنی عملی دلچسپیوں کو ختم کر دینا چاہیئے ورنہ ہو سکتا ہے کہ اپنے سیاسی اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا لالچ انہیں آجائے۔ اگر یہ ہوا تو حکومت چوروں گرہ کٹوں اور ڈاکوؤں کی حکومت ہو جاتی عموماً جماعت عاملہ اور اعلیٰ عہدہ داروں کو گمراہ اور بے ایمان کرنے کا سبب بے ایمان سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ اگر سیاسی پارٹیاں ایمان دار ہوں اور اپنے فرائض کی بجا آوری میں مستعد ہوں تو جماعت عاملہ اور عہدہ دار کبھی بے ایمانی نہیں کر سکتے۔

آخر میں ہمیں ادنے عہدہ داروں کی اخلاقی صفات کو دیکھنا چاہیئے۔ یہی لوگ ہیں جو درحقیقت حکومت کے کاروبار کو چلاتے ہیں۔ جو حکومت کے ہاتھ پاؤں کان اور آنکھیں ہوتے ہیں یہ اگر کوتاہی کریں ان میں اگر اپنے پبلک فرض کا احساس نہ ہو۔ ان میں اگر عزت نفس، ضمیر کی صداقت، اور اپنے عہدہ کے وقار اور تمکنت کی پاس داری نہ ہو تو سارے نظام کے چوپٹ ہو جانے کا اندیشہ رہے۔ پولس کانسٹبل، پٹواری، نہر کا امین مدرس اور منشی فوج کا سپاہی اور ان کے چھوٹے چھوٹے افسر ہی درحقیقت حکومت کے ستون ہوتے ہیں۔ اگر یہ ستون کمزور اور کھوکھلے ہیں تو حکومت کی عمارت بھی کبھی مضبوط اور پائدار نہیں ہو سکتی ان میں اخلاقی صفات کا ہونا سب سے زیادہ مقدم ہے۔ اعلیٰ عہدہ دار آتے اور جاتے رہتے ہیں سیاسی پارٹیاں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں لیکن ان لوگوں کی جماعت قائم رہتی ہے۔ ان کی روایات مسلسل اور یکساں رہتی ہیں ووٹروں کے بعد ریاست کے نظام میں بنیادی حیثیت انہیں لوگوں کی ہے اور ریاست کی تندرستی اور طاقت کا انحصار۔ انھیں کے اوپر ہے۔ ان میں اعلیٰ اخلاقی صفات کا پیدا کرنا گویا کل قوم کی اخلاقی حالت کو سدھارنا ہے۔ ان میں جذبہ خدمت، ایمان داری اور احساس فرض پیدا ہو جائے تو ریاست کی ترقی کی ایک سب سے بڑی رکاوٹ کا ازالہ ہو جائے۔ اور اگر یہ بگڑے ہوئے ہوں تو آوے کا آوا بگڑ جائے۔ ان کی اصلاح کی صورتیں یہ ہو سکتی ہیں کہ اعلیٰ عہدہ دار اپنے عمل سے اچھی مثال ان کے سامنے رکھیں برائی کی سخت گیری سے گرفت اور بھلائی کی قدر دانی کریں۔ لٹریچر اور تعلیم میں ایک عام اخلاقی فضا پیدا کی جائے اور ملازموں کو معقول تنخواہیں دی جائیں تاکہ بغیر بے ایمانی کے ان کا گذر چل سکے۔

غرضکہ پنچایتی نظام کی کامیابی کے لئے پبلک زندگی میں ووٹر سے لے کر حاکم اعلیٰ تک سب میں عمدہ اخلاقی صفات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

آخر میں ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا خاص طور پر ضروری ہے۔ نجی فائدہ اور پبلک فائدہ ادنیٰ وفاداری اور اعلیٰ وفاداری جن کے فرق کو میں نے بیان کیا تھا ان کے کئی درجے ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ہمیشہ تنگ کے مقابلہ میں کشادہ ادنےٰ کے مقابلہ میں اعلیٰ کو ترجیح دینا چاہیئے۔ ذرائع آمدورفت کی ترقی نے تمام قوموں اور ملکوں کو ایک ہی رشتہ میں پرو دیا ہے۔ ساری دنیا ایک برادری/خاندان بن گئی ہے دنیا کے سب رہنے والے جسم کے مختلف حصے بن گئے ہیں۔ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا کا ایک حصہ مصیبت میں مبتلا ہو تو اس کا اثر دنیا کے دوسرے حصوں پر نہ پڑے۔ اس لئے تمام ایسی پالیسیاں جن میں تنگ نظری سے کام لے کر فرقوں نسلوں مذہبوں اور قوموں کی ادنےٰ محبتوں کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے اور انسانیت کی اعلیٰ محبت اور اس کی صلح و آشتی کو قربان کیا جاتا ہے چلنے والی چیزیں نہیں ہیں فتنہ و فساد سے جتنا دوسروں کو نقصان پہنچے گا اتنا ہی خود اپنی ذات کو بھی پہنچے گا اس لئے تمام انسانوں کو مل کر اور متحد ہو کر سائنس کی تحقیقات سے مدد لینے اور فطرت کی قوتوں پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی جگہ دنیا سے بیماری غریبی گندگی بدصورتی بے علمی اور ناسمجھی کو دور کرنا چاہیئے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے دنیا کے انسان نما درندوں کو واقعی انسان بنایا جا سکتا ہے۔

تقریر اور اخبار

(از جناب محمد عاقل صاحب)

دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کا لوہا آدمیوں کو ماننا پڑتا ہے۔ ایک سنڈے مسٹنڈے دیو جیسے قوی ہیکل پہلوان کو دیکھ کر خواہ مخواہ رعب پڑتا ہے۔ اس کی جسمانی قوت کے سامنے سب لوگ کمزور بے بس معلوم ہوتے ہیں۔ ہم اس کی طاقت کو پسند کرتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے ہیں۔ ہم اسے دوست بناتے ہیں تاکہ اس کی طاقت سے فائدہ حاصل کر سکیں اور اس کی دشمنی سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کی طاقت ہمارے خلاف استعمال نہ ہو۔ ہماری ہڈیوں کا چکنا چور، ہمارے بدن کو لہولہان نہ کر دے۔ ہمارے روٹی کپڑے اور مکان، ہمارے زر و مال اور اندوختے کو ہم سے نہ چھین لے۔ اپنی جسمانی قوت سے ایک طاقتور شخص اپنی مرضی کے مطابق لوگوں سے کام کراتا اور اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے سے روکتا ہے۔ غرضکہ رہنمائی اور سرداری کی سب سے پہلی اور سب سے پرانی صفت جسمانی قوت ہے۔ اس کے بعد اور قوتیں بھی پیدا ہوتی ہیں جن سے کچھ لوگ دوسروں کے مقابلہ میں سربلند اور ممتاز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً علم کی طاقت ہے کہ اس سے آدمی ہوا، بھاپ، بجلی سے کام لے کر اپنی طاقت کو بہت بڑھا لیتا ہے اور سب لوگوں سے جس طرح چاہتا ہے، ناچ نچاتا اور ناک رگڑواتا ہے۔ تو جیسے دنیا کی ان چیزوں کو طاقت حاصل ہے ویسے ہی تقریر اور اخبار بھی دنیا کی دو بڑی طاقتیں ہیں۔

پہلے تقریر کو لیجیے۔ تقریر آواز کے زیر و بم لہجہ کے اُتار چڑھاؤ کی کرشمہ سازی ہے۔ آواز میں ایک قوت ہوتی ہے۔ شیر کی دہاڑ، بادل کی گرج، بجلی کی کڑک سے ایک ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ مور کی چنگھاڑ، کوئل کی کوک، اور پپیہے کی پی کہاں میں ایک درد اور کیفیت ہوتی ہے جو دل کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ انسان کی آواز میں یہ سب چیزیں جمع کی جا سکتی ہیں۔ ایک وقت میں اسے کڑک اور گرج بھی بنایا جا سکتا ہے اور دوسرے وقت میں آہ اور کراہ بھی۔ ایک وقت میں اس میں نفرت اور حقارت

بھی بھری جا سکتی ہے اور دوسرے وقت میں پریم اور محبت بھی۔ ایک وقت میں کسی کام کے کرانے کے لئے جتنی ترغیب اور تحریص کی ضرورت ہے وہ سب اس میں جمع کی جا سکتی ہے اور دوسرے وقت میں کسی کام سے روکنے کے لئے جتنی کراہیت اور بیزاری پیدا کرنا ضروری ہے وہ سب پیدا کی جا سکتی ہے۔ غرضکہ انسانی آواز کی قوت اس کی جسم کی قوت سے بھی بہت بڑی ہے۔ جسم کی قوت سے ایک وقت میں ایک آدمی زیادہ سے زیادہ تین چار آدمیوں پر غالب آ سکتا ہے۔ لیکن آواز کا جادو جہاں تک آواز پہنچ سکتی ہے سب کو اپنے اثر میں لا سکتا ہے۔

جس شخص کی آواز میں لوچ، بلندی اور کڑاکا ہوتا ہے، جس کے پاس الفاظ کا اچھا ذخیرہ ہوتا ہے وہ بڑے مجمع کے دل موہ لیتا ہے اور سیاسی زندگی میں اس کی رہنمائی کو لوگ ماننے لگتے ہیں۔ جس جماعت کے ساتھ وہ شامل ہو جاتا ہے اس کی کامیابی یقینی سمجھی جاتی ہے۔ عوام اس کے نقطوں پر ناچتے ہیں۔ جب چاہتا ہے انھیں ہنسا دیتا ہے جب چاہتا ہے رلا دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے انھیں محبت سے بھر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے نفرت سے۔ جب چاہا انھیں ابھار کر قتل و غارت گری پر آمادہ کر دیا اور جب چاہا ان میں امن و سکون کی تمنا پیدا کر دی۔ عوام کے دل اس کے ہاتھ میں ایک ستار کے تاروں کی طرح ہوتے ہیں جن پر جس قسم کا راگ جب چاہتا ہے چھیڑ دیتا ہے اور دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کئے رہتا ہے۔ دنیا کی بہت سی بڑی بڑی جنگیں۔ بڑے بڑے انقلاب، بڑی بڑی تعمیری اور تہذیبی کوششیں مقرروں کی آواز کی ہی کرشمہ سازیاں ہیں۔ پرانے زمانے میں شاعر جب تحریر کا رواج عام نہیں ہوا تھا اپنی خطابت کی قوت سے ہی مشہور ہوا کرتے تھے اور ہمارے ملک کے شاعروں میں تو یہ بات آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان ملکوں میں جہاں پرانے زمانے میں پنچایتی حکومت قائم تھی (مثلاً یونان اور روم میں) خطابت کو سیاسی زندگی میں بڑی زبردست اہمیت حاصل تھی اور آج بھی ہماری سیاسی زندگی میں تقریر کی اہمیت کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے دنیا کے مذہبی دور میں منبر و محراب سے ہی کام لیا جاتا تھا اور اس کے ذریعہ ہزاروں گمراہوں کو نیکی کا راستہ اور ہزاروں نیک لوگوں کو گمراہ کیا جاتا تھا۔ آج بھی ایک مذہبی مبلغ کے لئے مقرر ہونا بہت ضروری ہے۔ خوش بیان وکیلوں کی پیروی سے مقدمے عدالتوں میں جیتے جاتے ہیں۔ سفیروں اور ایلچیوں کی تقریروں سے دو حکومتوں کے درمیان تعلقات

اچھے یا برے کرائے جا سکتے ہیں۔ سیاسی رہنماؤں اور مدبروں کی تقریروں سے حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ نئی نسلوں میں تعلیم پھیلانے کا ذریعہ بھی تقریر ہی ہوتی ہے اور ایک فصیح معلم کا درجہ بہت بڑا سمجھا جاتا ہے۔ غرضکہ تقریر کی حکومت کا حلقہ بہت وسیع ہے اور اس کی طاقت بہت زبردست ہے۔

لیکن خطابت کی حریف ایک دوسری طاقت بھی ہے جسے صحافت کہتے ہیں۔ اسے چھاپہ کی ایجاد نے پیدا کیا ہے۔ چھاپہ کی ایجاد سے پہلے ایک شخص کے لکھے ہوئے کو صرف ایک شخص ہی پڑھ سکتا تھا۔ ایک سے زیادہ آدمیوں کے لیے پڑھنا ممکن نہیں تھا سوائے اس صورت کے کہ لکھی ہوئی تحریر کو مجمع میں سنایا جائے جس میں تحریر اور تقریر دونوں جمع ہو جاتی تھیں۔ تحریر کے حلقہ کو بڑھانے کے لیے لوگ اپنی لکھی ہوئی چیزوں کی نقل کرا کے تقسیم کرتے تھے لیکن یہ کام بہت مشکل، مہنگا اور دیر طلب ہوتا تھا۔ اپنی تحریر کو ہر دفعہ نقل کرانے میں پہلے کے برابر محنت کرنا پڑتی تھی اور کاتب کی غلطیوں کی صحت ضروری تھی۔ لیکن چھاپہ کی ایجاد نے اس کام کو بہت سہل بنا دیا ہے۔ چھاپہ کا علم تو آدمیوں کو بہت پرانے زمانے سے ہے۔ مہر ایک طرح کی چھاپ ہے جس کا استعمال نہایت قدیم زمانہ میں مثلاً مصریوں کے یہاں شروع ہو گیا تھا۔ اسی طرح سکہ بھی چھپی ہوئی چیز ہے۔ جاہل آدمیوں نے ہر عہد میں دستخط کے لئے لکڑی یا دھات کی مہروں کا استعمال کیا ہے۔ چین میں دوسری صدی عیسوی میں نہایت مشہور تصنیفوں کی طباعت شروع ہو گئی تھی لیکن اچھی سیاہی اور مناسب کاغذ کی دقتوں کی وجہ سے چھاپہ کی ایجاد سے لوگ پوری طرح فائدہ نہیں اٹھا سکے تھے۔ یورپ میں پندرھویں صدی عیسوی تک باقاعدہ چھپائی شروع نہیں کی جا سکی تھی۔ اور اخبار جو ہمارے زمانے کی سب سے بڑی طاقت ہے اس کی عمر دو سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔

موجودہ زمانے میں پنچایتی حکومت بڑے بڑے ملکوں میں صرف پریس کی ترقی کی وجہ سے ممکن بن سکی ہے۔ قدیم یونان کی پنچایتی حکومت جس کے کام کی آج تک بڑی دھوم ہے، صرف چھوٹے شہروں تک محدود تھی۔ یونان کے شہری صرف گفتگو اور تقریر کے ذریعہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتے اور ان کو کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کے لئے آمادہ کرتے تھے۔ جن لوگوں کو تقریر میں مہارت حاصل ہوتی تھی وہ رعایا کے رہنما بن جاتے تھے اور جو وہ چاہتے تھے رعایا اسی کے مطابق اپنی رائے دیتی تھی۔ ان کا سیاسی اثر بہت بڑھ جاتا تھا اور یہی لوگ عملاً حکومت کرتے تھے۔ روم میں ہر چند شہریت کے حق کو وسیع اور عام کر دیا گیا تھا لیکن اس سے

فائدہ صرف وہی لوگ اٹھا سکتے تھے جو روم کے قریب رہتے تھے باقی سب لوگ عملاً شہری حق سے محروم تھے۔

پنچایتی حکومت کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کو سیاسی واقعات سے باخبر رکھا جائے تمام مسائل سے واقفیت اور دلچسپی پیدا کرائی جائے۔ وقت کے وقت جو نئے سیاسی مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں رعایا اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو فوراً ان کی اطلاع دی جائے۔ ملک کے رہنماؤں کی ان مسائل کے بارے میں جو رائے ہے اس سے بھی سب کو واقف کرایا جائے۔ مختلف پالیسیوں کی طرفداری یا مخالفت میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ سب رائے دینے والوں کے سامنے رکھا جائے۔ رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کو غور و فکر اور بحث و مباحثہ میں شریک کیا جائے۔ لوگ پہلے واقعات کا پورا علم حاصل کریں اور پھر ان پہ اپنی رائے اور مرضی کا اظہار کریں۔ جب تک پریس کو ترقی نہیں ہوئی تھی ان سب کاموں کو کرنے کے لئے صرف تقریر کا ایک موثر ذریعہ موجود تھا۔ روم میں نقیب عوام کی مجلس کے منعقد ہونے کا اعلان کرتے تھے یا عام گذرگاہوں پر ہاتھ سے لکھے ہوئے اشتہار چپکا دئے جاتے تھے۔ جہاں تک آدمی کی آواز کو جلد سے جلد پہنچایا جا سکتا تھا۔ وہی پنچایتی حکومت کی حد بن جاتی تھی۔ کیونکہ آواز سننے والے لوگ ہی پنچایتی کارروائی میں شریک ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پنچایتی حکومتوں کا رقبہ اس زمانے میں بہت چھوٹا ہوا کرتا تھا۔

لیکن پریس اور وسائل خبر رسائی کی ترقی نے اخبار، پوسٹرس، ہینڈبل کے ذریعہ بڑے بڑے ملکوں بلکہ ساری دنیا کو ایک کر دیا ہے۔ اب ایک خبر کو ایک وقت میں ساری دنیا میں مشتہر کیا جا سکتا ہے اور ساری دنیا والوں کی رائے کا اس کے بارے میں پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

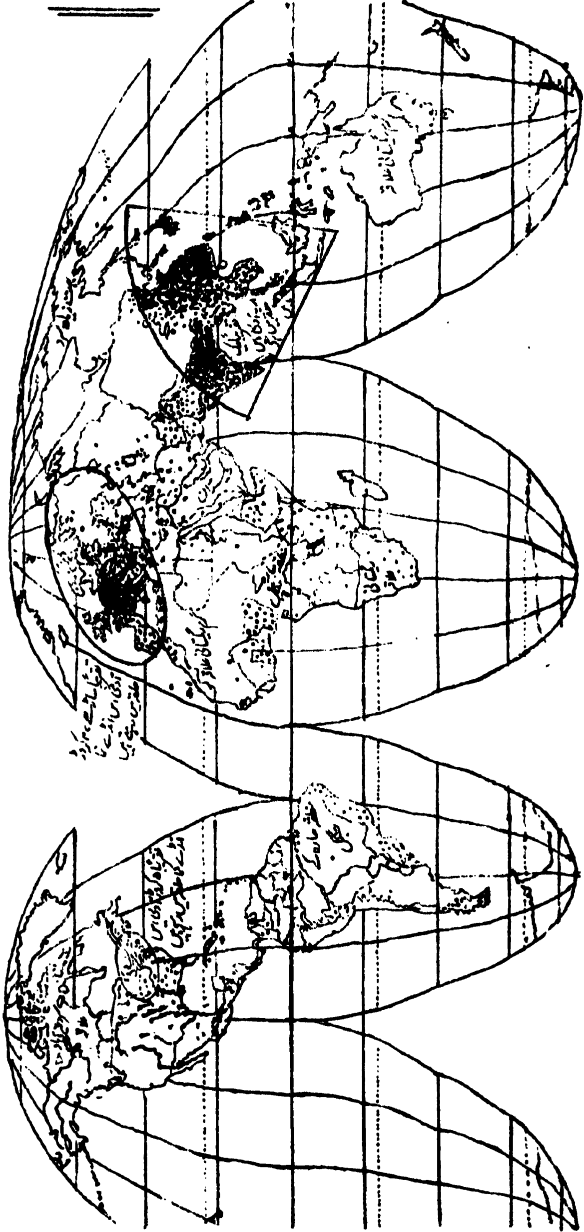
پریس کی اس ترقی نے اخبار کے ایڈیٹروں اور مالکوں کی اہمیت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ کیونکہ اخبار صرف خبریں ہی شائع نہیں کرتے بلکہ بعض ترتیب دیتے اور ان کے بارے میں اپنی رائے بھی ظاہر کرتے ہیں بعض خبروں اور رایوں کو دبا بھی دیتے ہیں اور بعض کو نمایاں اور بعض کو کم نمایاں جگہ دیتے ہیں۔ ان تمام ذریعوں سے وہ لوگوں کو اپنی رائے کے مطابق کام کرنے یا نہ کرنے کی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ پھر چونکہ ایک ترقی یافتہ اخبار تعلیم یافتہ ملکوں میں گاؤں گاؤں اور محلہ کے ہر شخص تک پہنچتا ہے اس لئے اس کی بات کے سننے والے بہت ہوتے ہیں۔ مقرر اخبار کی امداد کے بغیر صرف چھوٹے چھوٹے مجمعوں کو اپنا ہم خیال بنا سکتا

ہے۔ ایک مجمع کے سامنے وہ ایک دن تقریر کرتا ہے دوسرے دن کسی دوسرے محلہ یا گاؤں یا شہر میں اسے تقریر کے لئے جانا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ اپنی تقریر کا اثر لوگوں پر روزانہ نہیں ڈال سکتا۔ لیکن اخبار روزانہ اپنے پڑھنے والوں کو جو ہر گاؤں اور ہر محلے میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اپنا خیال سمجھا سکتا ہے۔ مقرر اور اخبار میں اگر ان بن ہو جائے تو اخبار کی کامیابی کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے آج کل اخبار کی طاقت مقرروں سے بھی زیادہ زبردست ہوگئی ہے۔ ان کی خوشنودی سے بڑے بڑے فائدے اور ان کی خفگی سے بڑے بڑے نقصان اٹھانا پڑتے ہیں۔

طاقت اپنی جگہ پر نہ اچھی چیز ہے نہ بری۔ یہ ایک غیر اخلاقی صفت ہے۔ اس کی اچھائی اور برائی کا انحصار اس کے استعمال کے طریقہ پر ہوتا ہے۔ ایک قوی شخص اپنی قوت کو کمزور کی مدد کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے اور اس کے دبانے اور نقصان پہنچانے کے لئے بھی۔ اس لئے طاقت کو ہر جگہ بالکل آزاد اور خود مختار نہیں چھوڑنا چاہیئے بلکہ اس پر ایسی پابندیاں عاید کرنا چاہیئں جس سے اس کی بھلائی کے امکانات ترقی پا سکیں اور اسی کی برائی کو روکا جا سکے۔ ایک زمانے میں تقریر اور تحریر کی آزادی کو ایک مسلمہ حقیقت کا مرتبہ ملا ہوا تھا اور ہر ترقی پسند تحریک کے مطالبات میں انھیں پہلی صف میں جگہ دی جاتی تھی۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا جب بہت سے اخبار نکلتے تھے اور صرف چند اشخاص نے اخبار کی ملکیت پر اجارہ حاصل نہیں کیا تھا۔ مگر اب اخباروں کا چلانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں رہی ہے۔ اس کی کامیابی کے لئے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہونے لگی ہے اور جس شخص کے پاس جتنا زیادہ سرمایہ ہوتا ہے وہ اپنے حریف کو اتنے ہی جلد ختم کر سکتا ہے۔ پھر آج کل اخبار کی کامیابی کے لئے خبروں اور تنقیدوں کے پڑھنے والوں کی ہمدردی اور خوشنودی کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی ہے۔ کیونکہ دواؤں، تفریحوں اور دوسرے اشتہاروں کی آمدنی سے اخبار پڑھنے والوں کی ناپسندیدگی کے باوجود اخباروں کو چلایا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اخبار کے مالک اور ایڈیٹر ملک کے نہایت خیر خواہ لوگوں کی مخالفت کے باوجود اپنے ذاتی فائدے یا اپنے دوستوں کے فائدہ کے لئے ایک نقصان رساں پالیسی کی تبلیغ و اشاعت کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح مقرر بھی اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن اگر انھیں ریڈیو کی جدید ایجاد کی حمایت حاصل نہ ہو تو اخبار کے مقابلہ میں ان سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے وہ

بہت ہی کم ہے۔

دنیا کے لئے یہ مسئلہ واقعی بہت اہم ہے کہ وہ اپنی بڑھتی ہوئی طاقت کو کس طرح استعمال کرے کہ اس کا نقصان کم اور فائدہ زیادہ ہو۔ ہماری تمام تہذیب و ترقی کا انحصار اسی مسئلہ کے معقول حل پر ہے



دنیا کی آبادی کی تقسیم

(نوٹ) اس نقشہ کا ہر نقطہ دس ہزار آدمیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ نقشہ میں جو حلقے بنائے گئے ہیں ان میں دنیا کی ۴/۵ آبادی بستی ہے — دنیا کی کل آبادی ایک ارب نوے کروڑ ہے ان حلقوں میں ایک ارب پچاس کروڑ آدمی بستے ہیں۔

امریکہ کا دستور اساسی

(از محمد عاقل صاحب)

امریکہ کے دستور کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت اس کی جمہوریت ہے۔ یعنی حکومت کے ہر شعبہ میں عوام کی رائے اور مرضی کو پورا پورا دخل ہے۔ طرح طرح سے کوشش کی گئی ہے کہ حکومت کے کاروبار میں تمام رعایا زیادہ سے زیادہ شریک ہو سکے۔ مقامی اداروں میں یہ کوشش سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ ریاستوں میں اس سے کم اور قومی حکومت میں اس سے بھی کم۔ ایسا قدرتی طور پر ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ مقامی اداروں میں تو ہر شہری حکومت کے کاروبار میں براہ راست شرکت کر سکتا ہے لیکن ریاست کے کاموں میں رقبہ کی وسعت اور تعداد کی کثرت کی وجہ سے ہر شخص براہ راست حکومت کے کاموں میں حصہ نہیں لے سکتا۔ قومی حکومت کے کام میں شریک ہونے کا موقع لوگوں کو اور بھی کم ملتا ہے۔

اس دستور کی دوسری خصوصیت اس کی لامرکزیت ہے یعنی قومی حکومت کے اختیارات بہت محدود ہیں اور ریاستوں اور مقامی اداروں کے اختیارات اور آزادیاں وسیع ہیں۔ امریکہ کا قومی دستور فیڈرل یا وفاقی دستور کہلاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ امریکہ کا قومی اتحاد مکمل نہیں ہے بلکہ نامکمل ہے۔ امریکہ کی ریاستوں نے متحد ہو کر اپنے سارے اختیارات مرکزی حکومت کو سپرد نہیں کئے ہیں بلکہ صرف ان اختیارات کو مرکزی حکومت کو سونپا ہے جن کا ذکر دستور میں صراحتاً موجود ہے اور باقی ہر قسم کے اختیار کو انھوں نے اپنے لئے محفوظ رکھا ہے۔ دستور کی اس خصوصیت سے بھی پہلی خصوصیت یعنی جمہوریت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مرکزی حکومت کو چونکہ جمہور سے براہ راست تعلق نسبتاً کم ہے اس لئے اس کے اختیارات بھی محدود کر دئے گئے ہیں۔

امریکہ کے دستور کی تیسری خصوصیت "تقسیم اختیارات" ہے یعنی جماعت قانون ساز، جماعت عاملہ اور عدالت تینوں کو ایک دوسرے کے اثر سے آزاد رکھا گیا ہے۔ جماعت عاملہ کے اراکین اور عدالت

کے حاکموں کا تقرر، جماعت قانون ساز کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ تینوں رعایا کی طرف سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ اس خصوصیت سے بھی جمہوریت کو ترقی ہوتی ہے۔ کیونکہ جماعت عاملہ جس قانون کو چاہے جماعت قانون ساز میں پاس نہیں کرا سکتی۔ نہ عدالت سے اپنے حسب منشا فیصلہ کرا سکتی ہے۔ اسی طرح جماعت قانون ساز اور عدالت بھی ایک دوسرے پر اور جماعت عاملہ پر ناجائز دباؤ نہیں ڈال سکتے۔ نہ ان تینوں کی ملی بھگت سے رعایا پر ظلم و ناانصافی عرصہ تک جاری رکھی جا سکتی ہے۔

امریکہ کے دستور کی چوتھی خصوصیت (Initiative) (Referendum) اور (Recall) کے اختیارات ہیں جن کے ذریعہ امریکہ کی بعض ریاستوں کی رعایا کو حق حاصل ہے کہ اپنے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کی موجودگی کے باوجود خود براہ راست قانون سازی کے کام میں شریک ہو سکتی ہے۔ (Initiative) سے مراد یہ ہے کہ رعایا کی ایک مقررہ تعداد اگر چاہے تو کسی قانون کو اپنے نمائندوں کی معرفت نہیں بلکہ خود براہ راست مجلس قانون ساز میں پیش کر سکتی ہے (Referendum) سے مراد یہ ہے کہ بعض قوانین خصوصاً ایسے جن سے دستور اساسی میں ترمیم و تنسیخ کرنا منظور ہوتی ہے ان کے آخری فیصلہ کے لئے رعایا سے براہ راست ووٹ لیا جاتا ہے اور رعایا کی اکثریت کے ووٹ سے وہ منظور یا نامنظور کئے جاتے ہیں۔ (Recall) کا یہ مطلب ہے کہ اگر کسی منتخب شدہ افسر سے رعایا کی اکثریت ناخوش ہو جائے تو اس شخص کی مدت تقرر کے ختم ہونے سے پہلے رعایا اس کو برطرف کر سکتی ہے۔

امریکہ کے دستور کی نمایاں خصوصیات بیان کرنے کے بعد اب ہم دستور کی موجودہ شکل کو دیکھتے ہیں سب سے پہلے ہم ریاستوں کے دستور اساسی کا مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ تاریخی حیثیت سے یہ زیادہ قدیم اور جس زمانہ میں قائم کی گئی تھیں اس عہد کے جمہوری خیالات کو نہایت تکمیل کے ساتھ ظاہر کرتی ہیں۔

ہر ریاست کے دستور میں ذیل کے اجزائے حکومت پائے جاتے ہیں:۔

(۱) سب سے اول اس کا ایک دستور اساسی ہوتا ہے جسے اس کے تمام شہریوں نے بنایا ہے اور جس میں ترمیم اور تنسیخ ان کے ووٹ کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

(۲) دوسرے دو ایوانوں کی ایک مجلس قانون ساز۔ ان دونوں ایوانوں کے ارکین کا انتخاب ایک

سے چار سال کی مدت کے لئے تمام بالغ آبادی کرتی ہے اعلیٰ ایوان کا نام سینیٹ ہوتا ہے اور اس کا حلقہ انتخاب زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ دونوں ایوانوں کے ارکین کو تنخواہیں ملتی ہیں۔ دونوں کے اختیارات تقریباً ساوی ہوتے ہیں۔ گو اکثر ریاستوں میں بجٹ پر بحث پہلے ایوان ادنیٰ میں ہوتی ہے اور پھر سینیٹ میں۔ بعض ریاستوں میں عہدہ داروں کا تقرر گورنر سینیٹ کی رائے معلوم کرنے کے بعد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ریاستوں میں جب اعلیٰ افسروں پر فرائض منصبی ٹھیک طریقہ پر انجام نہ دینے کے الزام میں مقدمہ چلایا جاتا ہے تو سینیٹ کو عدالت کے فرائض بھی انجام دینا پڑتے ہیں۔

(۳) ریاستوں کی حکومت کا تیسرا جزو گورنر ہے جسے عموماً دو سال کے لئے تمام شہری منتخب کرتے ہیں۔ گورنر جماعت عاملہ کا اعلیٰ افسر ہوتا ہے اور مجلس قانون ساز کے پاس کئے ہوئے قوانین کو مسترد کرنے کا حق رکھتا ہے لیکن اگر دونوں ایوانوں کی دو تہائی اکثریت اس قانون کو دوبارہ پاس کردے تو اس کا یہ حق زائل ہوجاتا ہے۔

(۴) ریاستوں کی حکومت کا چوتھا جزو انتظام کرنے والے افسر ہوتے ہیں جن میں سے بعض تو علیحدہ علیحدہ کام کرتے ہیں اور بعض بورڈ بنا کر۔ ان کا انتخاب ہوتا ہے اور یہ کم مدت کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔ یہ افسر صرف قانون کے پابند ہوتے ہیں اور مجالس قانون ساز کے اثر سے آزاد ہوتے ہیں گورنر بھی صرف چند معاملات میں ہی ان کی نگرانی کرتا اور انھیں ہدایت دے سکتا ہے ورنہ یہ بیشتر رعایا کو براہ راست جواب دہ ہوتے ہیں۔

(۵) ریاستوں کی حکومت کا پانچواں جزو ادنیٰ افسر ہوتے ہیں جنھیں یا تو گورنر مقرر کرتا ہے یا مجلس قانون ساز یا اعلیٰ افسر اور ان کے بورڈ۔

(۶) ریاستوں کی حکومت کا چھٹا جزو جج ہوتے ہیں جنھیں یا تو کل ریاست کے لئے سب شہری منتخب کرتے ہیں یا مقامی علاقوں کے لئے مقامی لوگ منتخب کرتے ہیں۔ ان کے تقرر کی مدت بھی عموماً مختصر ہوتی ہے ان عہدہ داروں کی تنخواہیں عموماً کم ہی ہوتی ہیں۔

—

یہ تو ریاستوں کی حکومت کا حال ہوا۔ لیکن امریکہ کے اپنے والوں کو تین مختلف قسم کی حکومتوں کے احکام ماننا ہوتے ہیں۔ وفاقی حکومت، ریاستوں کی حکومت، اور مقامی حکومت یعنی لوکل سلف گورنمنٹ
آئیے اب مقامی حکومتوں یا لوکل سلف گورنمنٹ کا مطالعہ کریں۔

امریکہ کی جمہوری حکومت نہایت مکمل شکل میں اسی جگہ نظر آتی ہے۔ امریکہ کے سیاسی اداروں کی جو لوگ بہت تعریف کرتے ہیں وہ اپنی مقامی اداروں کو دیکھ کر کرتے ہیں۔ مقامی حکومت کی مختلف علاقوں میں مختلف شکلیں ہیں۔ شمال مشرق میں کچھ اور شکل ہے، شمال مغرب میں کچھ اور۔ اسی طرح جنوب اور وسط مشرق اور وسط مغرب کی شکلیں بھی مختلف ہیں۔ شمال مشرق یعنی نیو انگلینڈ کے علاقہ میں قدیم وضع کی ٹاؤن شپ پائی جاتی ہے جن میں ہر سال قصبہ کی تمام آبادی کا ایک جلسہ ہوتا ہے اور اس میں سالانہ آمد و خرچ کا حساب پیش کیا جاتا ہے۔ گذشتہ سال کے ــــــــ Selectmen یعنی عہدہ داروں سے ہر شخص کو جواب طلب کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور نئے عہدہ داروں یعنی سرپنچوں کا انتخاب سب شہریوں کے ووٹ سے کیا جاتا ہے۔ ٹاؤن شپ سے زیادہ وسیع رقبہ کاؤنٹی کا ہوتا ہے اور یہ ہندوستان کے ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرح بڑی سڑکوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں اور اپنے علاقوں کے ججوں کا بھی انتخاب کرتی ہیں۔ جنوبی ریاستوں میں ٹاؤن یا ٹاؤن شپ نہیں ہوتیں بلکہ وہاں حکومت کی ابتدا کاؤنٹی سے ہوتی ہے۔ کاؤنٹی کے افسروں کا انتخاب بھی تمام شہری براہ راست کرتے ہیں۔ وسطی اور مغربی ریاستوں میں ٹاؤن شپ اور کاؤنٹی دونوں پائی جاتی ہیں۔ لیکن امریکہ کے تمام علاقوں کی مقامی حکومتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ ان سب میں حکومت کے معاملات کا تصفیہ تمام شہری براہ راست خود ہی کرتے ہیں۔ افسروں کا تقرر مرکزی حکومتیں نہیں کرتیں بلکہ لوگ انھیں خود منتخب کرتے ہیں اور وہ اپنی رعایا کو براہ راست جواب دہ ہوتے ہیں۔ مقامی معاملات میں مرکزی حکومت کی مداخلت کو بالکل پسند نہیں کیا جاتا۔ شہروں کے انتظام میں بھی جمہوری نظام سے پوری طرح کام لیا جاتا ہے۔

اب اخیر میں ہم قومی یا فیڈرل حکومت کے دستور اساسی کو بیان کرتے ہیں۔ یہ تیسری حکومت ہے جس کے احکام امریکہ کے رہنے والوں کو ماننے پڑتے ہیں۔ فیڈرل یا قومی حکومت کے اجزا حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سب سے اول قومی کانگریس یعنی مجلس قانون ساز جس کے دو ایوان ہوتے ہیں۔ پہلے ایوان یعنی (House of Representatives) کے ارکین کا انتخاب دو سال کے لئے ہوتا ہے اور ہر بڑے ضلع کی ایک ایک نمائندہ منتخب کر کے بھیجا جاتا ہے۔ ریاست کے انتخاب میں حصہ لینے کے جو لوگ مستحق ہوتے ہیں وہی لوگ اس انتخاب میں بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ جنوب کی اکثر ریاستوں میں حبشیوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ دوسرے ایوان کا نام سینیٹ ہے اور اس میں ہر ریاست کی طرف سے دو نمائندے چھ سال کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ سینیٹ کے نمائندوں کی ایک تہائی تعداد کا انتخاب ہر دوسرے سال ہوتا ہے۔ ابتدا میں قومی سینیٹ کے ارکین کو ریاستوں کی مجالس قانون ساز منتخب کر کے بھیجا کرتی تھیں۔ لیکن ۱۹۱۳ء سے ہر ریاست کے شہری براہ راست انہیں منتخب کر کے بھیجنے لگے ہیں۔ سینیٹ کا کام یہ بھی ہے کہ پریسیڈنٹ جن افسروں کا تقرر کرتا ہے یہ ان کے تقرر کی منظوری دیتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر ملکوں سے جو معاہدے کئے جاتے ہیں ان کی منظوری کے لئے سینیٹ کے دو تہائی ووٹ حاصل کرنا ضروری ہیں۔ اعلیٰ افسروں پر بددیانتی یا غفلت بہ کارمنصبی کے سلسلہ میں جو مقدمے چلائے جاتے ہیں۔ ان کے لئے سینیٹ عدالت کا کام انجام دیتی ہے۔

(۲) قومی حکومت کا دوسرا جزو پریسیڈنٹ ہے جو جماعت عاملہ کا اعلیٰ افسر ہوتا ہے اور اسے چار سال کے لئے وہ لوگ منتخب کرتے ہیں جنہیں خاص طور پر اسی کام کے لئے ہر ریاست کے شہری چنتے ہیں۔ ان انتخاب کرنے والے لوگوں کی تعداد (House of Representatives) کے ارکان کی تعداد کے برابر ہوتی ہے لیکن چونکہ انتخاب کے وقت انہیں اپنے منتخب کرنے والوں سے یہ وعدہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ منتخب ہو کر اسی امیدوار کے حق میں ووٹ دیں گے جسے ان کے منتخب کرنے والے پسند کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ عملی طور پر پریسیڈنٹ کا انتخاب امریکہ کی کل بالغ آبادی ہی کرتی ہے۔ پریسیڈنٹ کو اختیار ہوتا ہے کہ ان قوانین کو جنھیں کانگریس نے منظور کیا ہے مسترد کر دے۔ لیکن اگر دونوں ایوان اس قانون کو دوبارہ دو تہائی اکثریت کے ساتھ پاس کر دیں تو پھر یہ مسودہ قانون پریسیڈنٹ کی مخالفت کے باوجود قانونی جامہ پہن لیتا ہے۔

(۳) قومی حکومت کا تیسرا جزو عدالت ہوتی ہے جس میں سپریم کورٹ اور وہ تمام فیڈرل کورٹ شامل ہیں جو قانون کے ذریعہ وجود میں آئیں۔ ججوں کا تقرر عمر بھر کے لئے پریسیڈنٹ، سینیٹ کی منظوری حاصل کرنے کے بعد

کرتا ہے۔ صرف سینیٹ کے سامنے مقدمہ چلا کر ان کو علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ ادنے فیڈرل کورٹ ملک کے ہر حصہ میں قائم ہیں اور ان کے فیصلوں کی اپیلیں سپریم کورٹ میں کی جاتی ہیں۔

امریکہ کے دستور کا حال جو ابھی بیان کیا گیا ہندوستان کے لئے خاص طور پر دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ ہم بھی ہندوستان میں ایک فیڈرل یا وفاقی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن امریکہ کے وفاق کی بنیادیں مضبوط ہیں کیونکہ اس کے مقامی اداروں میں جمہوریت نہایت کمل شکل میں پائی جاتی ہے۔ پہلے وہ اپنا ایک علیحدہ مستقل وجود رکھتے تھے اور بعد میں مل کر انھوں نے وفاق کی شکل اختیار کی۔ لیکن ہندوستان کی حکومت ایک طویل عرصہ سے منفرد اور مرکزیت پسند رہ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں جمہوریت اوپر سے چھن چھن کر نیچے پہنچ رہی ہے۔ ہمارے یہاں آل انڈیا ادارے تو سیاسی حیثیت سے خاصے ترقی یافتہ ہیں لیکن مقامی ادارے ابھی تک مرکزی اداروں کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔ ان میں ذاتی ذمہ داری کا احساس پیدا نہیں ہوا ہے۔ ان میں ابھی تک حکومت خود اختیاری نے پوری طرح جڑ نہیں پکڑی ہے۔ امریکہ کی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں قومی حکومت میں جمہوریت کے اجزا نسبتاً کم نظر آتے ہیں اور ریاستوں میں بہت زیادہ۔ مثلاً مرکزی سینیٹ کے ارکین کے تقرر کی مدت طویل یعنی چھ سال ہے۔ ریاستوں کی سینیٹ کی صرف دو سال۔ فیڈرل جج عمر بھر کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں ریاستوں کے جج مختصر مدت کے لئے۔ فیڈرل حکومت کے افسروں اور ججوں کا تقرر پریسیڈنٹ کرتا ہے لیکن ریاستوں میں ان کا انتخاب رعایا خود کرتی ہے۔

ہم بھی اگر ہندوستان میں اپنی دستوری حکومت کو مضبوط بنیاد پر قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں عوام کی سیاسی تعلیم اور جمہوری تنظیم کے لئے مقامی اداروں کی ترقی اور اصلاح کی سب سے زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔

غریبی

(محمد عاقل صاحب)

جارج برنارڈ شا، نے اپنے ایک ڈرامے میں جس کا نام میجر باربرا ہے غریبی کی ایک نہایت بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ اس کے ڈرامے کا ایک کیرکٹر سوال کرتا ہے "کیا غریبی ایک جرم ہے"؟ دوسرا کیرکٹر جواب دیتا ہے "سنگین ترین جرم! تمام دوسرے جرم اس کے مقابلہ میں نیکیاں ہیں۔ تمام دوسری بے عزتیاں اس کے مقابلے میں عروج اور کامرانی کے اعلیٰ مراتب ہیں۔ غریبی، بڑے شہروں پر ایک بلا کی طرح چھا جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہیبت ناک وبائیں پھیلتی ہیں۔ جو لوگ اس کو دیکھ، سن یا سونگھ سکتے ہیں ان کی روحیں فوراً مردہ ہو جاتی ہیں۔ جسے ہم جرم کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ کہیں قتل ہو گیا۔ کہیں چوری۔ کہیں دھول دھپا ہو گیا کہیں گالی گلوج۔ ان سب کا کوئی دیر تک باقی رہنے والا اثر نہیں ہوتا۔ یہ زندگی کی معمولی بیماریاں یا حادثے ہیں۔ لیکن لاکھوں غریب، ذلیل، گندے، آدھے بھوکے، آدھے ننگے جو لوگ ہوتے ہیں وہ ہمارے جسم اور روح کو برابر زہر دیتے رہتے ہیں۔ وہ سماج کی تمام خوشیوں کو مٹا ڈالتے ہیں۔ وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اپنی آزادیوں کو قربان کر دیں اور ایسی غیر فطری سختیوں اور بے رحمیوں کا انتظام کریں جن کی وجہ سے غریب لوگ ہمارے خلاف کبھی سر نہ ابھار سکیں اور اپنے ساتھ ہمیں بھی تباہی اور ذلت کے گہرے گڑھے میں نہ گھسیٹ لیں جرائم سے صرف بے وقوف ڈرتے ہیں۔ ہم سب کو جس چیز کا خوف ہے وہ غریبی ہے"۔

اسی ڈرامے میں ایک اور جگہ وہ لکھتا ہے "جب ہم ایک شخص کو کنگال دیکھتے ہیں اور دل میں سوچتے ہیں کہ کنگال ہے تو ہوا کرے ہمیں اس سے کیا، تو ہم ان نتیجوں کی طرف دھیان نہیں دیتے جو ہماری اس بے توجہی اور لاپرواہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہم جب ایک شخص کو کنگال رہنے دیتے ہیں تو گویا ہم اسے اجازت دیتے ہیں کہ وہ کمزور، جاہل، بیماریوں کا سوتا، بدصورتی اور گندگی کی ایک ڈراؤنی مورت بن جائے۔ ہم اسے اس بات کا پروانہ دیتے ہیں کہ وہ کمزور ہڈی والے بچوں کی نسل کو بڑھائے۔ وہ بازار میں اپنی محنت

کا معاوضہ کم طلب کرے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اپنی طرح کم اجرت پر کام کرنے کے لئے مجبور کرے۔ وہ ہمارے صاف اور ستھرے شہروں کو اپنے گندے اور کم حیثیت گھروندوں کے ذریعہ زہر اور جراثیم کا خزانہ بنا سکے ہم اس کی لڑکیوں کو اس بات کا اختیار دیتے ہیں کہ وہ ہمارے نوجوانوں کو گندی بیماریوں میں مبتلا کر سکیں اور اس کے لڑکے اپنے باپ کی غریبی کا بدلہ اس طرح لیں کہ قوم کی مردانہ خصوصیات کو تپ دق کے مریضوں جیسی شکلیں بنا کر، بزدلی، بدنصیبی، منافقت، سیاسی نااہلیت اور ظلم اور خوراک کی کمی کے اور جس قدر بھی دوسرے نتائج ہو سکتے ہیں ان سب میں تبدیل کر دیں۔"

برنارڈ شا کے ڈرامے کے ان دو اقتباسوں سے غریبی کی خرابیوں کا ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے غریبی دنیا میں ہمیشہ سے رہی ہے لیکن پرانے زمانے میں غریبوں کے مسئلہ کو وہ اہمیت حاصل نہیں تھی جو آج کل اسے حاصل ہے۔ موجودہ زمانے میں سائنس کی نئی نئی ایجادوں، علم کی بے شمار ترقیوں اور جمہوری اصولوں کے عام رواج نے انسانوں کی امنگوں اور حوصلوں کو بہت بڑھا دیا ہے۔ جو چیزیں قدیم زمانے میں نادر اور کمیاب سمجھی جاتی تھیں اب ان کا شمار زندگی کی معمولی ضرورتوں میں ہونے لگا ہے۔ دولت کے پیدا کرنے کے امکانات کو خوب ترقی ہو گئی ہے۔ اب پرانی محرومیاں اور مجبوریاں باقی نہیں رہی ہیں بلکہ اب تو شکایت اس بات کی کی جاتی ہے کہ دولت کی پیداوار ضرورت سے زیادہ ہو گئی ہے۔ گیہوں گوشت، لوہا، کوئلہ، تانبا، ربر اور معدنی تیل کے پیدا کرنے والے یہی رونا روتے رہتے ہیں کہ انھیں اپنے مال کے لئے خریدار نہیں ملتے۔ یہی حال موٹر کاروں، گراموفونوں، سینے کی مشینوں، ریڈیو وغیرہ بنانے والوں کا ہے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ مال بہت زیادہ بن گیا ہے۔ غرض ایک طرف تو کھلیان بھرے ہوئے نظر آتے ہیں، گوداموں اور دکانوں میں مال کے انبار لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ پکے ہوئے کھیتوں میں خریداروں کے نہ ملنے کی وجہ سے ہل چلا دیے جاتے ہیں، چائے کی پیٹیوں کو سمندر میں ڈبو دیا جاتا ہے، گوشت کا کھاد بنا دیا جاتا ہے اور دوسری طرف ان بدنصیبوں اور محروموں کا مجمع ہوتا ہے جو دولت کے اس تمام انبار کو دیکھتا ہے لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس مجمع میں کچھ اپاہج، معذور، نااہل اور نالائق لوگ بھی شامل ہوتے ہیں لیکن ان میں زیادہ تر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو تندرست، توانا، جفاکش اور اوسط درجے کی ذہانت، مہارت اور کیرکٹر رکھنے

والے ہوتے ہیں۔ انہیں اگر کام کا موقع دیا جاتا تو یہ ہرگز کسی دوسرے شخص کے مقابلہ میں پیچھے نہ رہتے اور اپنی محنت سے دولت کی مقدار میں ضرور اضافہ کرتے لیکن یہ لوگ موجودہ معاشی اور معاشرتی نظام میں بے کار رہنے یا کم اجرت پر کام کرنے یا حکومت سے بے روزگاری کی امداد یا اسی قسم کی کوئی اور مدد لے کر زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ ان کی آمدنی بہت کم ہوتی ہے اور یہ لوگ باوجود اس کے کہ انہیں چیزوں کی ضرورت یا خواہش بہت زیادہ ہوتی ہے پھر بھی ان سے محروم رہتے ہیں۔ ایک طرف دولت کی مقدار کو بڑھانے کے لئے نہایت کثیر امکانات کا موجود ہونا اور مال بنانے والوں کا یہ شکایت کرنا کہ مال ضرورت سے زیادہ پیدا ہو گیا ہے اور دوسری طرف غریبی، ضرورت اور محرومی —— یہ بیسویں صدی کا وہ پیچیدہ معمہ ہے جس کا فوری اور قابل اطمینان حل سوچنا ہماری نسل کے لئے نہایت ضروری ہو گیا ہے۔

آبادی کا ایک کثیر حصہ اس مال سے جو موجود ہے کیوں فائدہ نہیں اٹھا سکتا اس سوال کا نہایت سہل جواب جس پر سب متفق ہو سکتے ہیں تو یہ ہے کہ اس کے پاس خریدنے کی قوت نہیں ہوتی۔ وہ جب بازار میں جاتا ہے تو اس کی جیب خالی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی جیب کیوں خالی ہوتی ہے اس کے پاس خریدنے کی قوت کیوں نہیں ہوتی اس کے جواب بہت سے ہو سکتے ہیں اور اس میں رائے کا اختلاف بھی خوب پیدا ہو سکتا ہے۔ قوت خرید کی کمی یورپ کے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے اور ایشیا کے زراعتی اور پس ماندہ ملکوں میں بھی۔ یہ آزاد اور خود مختار ملکوں میں بھی ملتی ہے اور محکوم نو آبادیوں میں بھی قوت خرید کی کمی کا جو لوگ شکار ہوتے ہیں ان میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کی کشمکش میں کامیاب ہونے کے لئے پیدائشی طور پر ناموزوں ہوتے ہیں یعنی ایسے لوگ جن کے جسم یا دماغ پیدائشی طور پر کمزور یا ناقص ہوتے ہیں یا کسی اور وجہ سے یہ لوگ اپاہج، معذور اور نا اہل بن جاتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی تعداد مجموعی طور پر بہت زیادہ نہیں ہوتی۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو نسلی، پیدائشی یا طبعی طور پر تو نا اہل نہیں ہوتے بلکہ اپنے حالات اور ماحول کی خرابی کی وجہ سے اپنی قوت خرید کو بڑھانے میں ناکامیاب رہتے ہیں۔

پھر حالات کی خرابی بھی مختلف قسم کی ہو سکتی ہے۔ مثلاً ہندوستان کی مثال کو اگر سامنے رکھا جائے

تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں کی غریبی ساری دنیا سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ اس ملک میں دولت کے قدرتی وسائل بہت کثیر تعداد میں موجود ہیں لیکن پھر بھی لوگ غریب ہیں اور ان کی قوت خرید کی کمی کا رونا تمام دنیا روتی رہتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ملک کے لوگوں کے لئے کیوں یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی قوت خرید کو بڑھا کر دولت کے اس انبار سے فائدہ اٹھائیں جسے خریداروں کے نہ ملنے کی وجہ سے ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں لوگ بہت سی باتوں کو پیش کرتے ہیں کوئی کہتا ہے یہاں مذہبیت کا بڑا زور ہے۔ یہاں کے لوگوں کو دنیا کی چیزوں کا بالکل شوق نہیں ہے۔ یہ تو سب اللہ والے اور مہاتما ہیں۔ یہ تو دوسرے جنم یا عاقبت کی خوشیوں کی فکر میں رہتے ہیں اور اس دنیا کی زندگی کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ اس لئے دولت پیدا کرنا ہی نہیں چاہتے کوئی کہتا ہے کہ اس ملک کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ اتنی بڑی آبادی کا پالنا ہندوستان کے لئے ناممکن ہے۔ جو کچھ پیدا ہوتا ہے اسے آدھا پیٹ بھر کر سب لوگ کھا لیتے ہیں۔ کسی اور چیز کے خریدنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ کوئی کہتا ہے یہاں کے کسانوں کو ملک کے زیادہ تر حصہ میں پانچ مہینہ سے نو مہینہ تک بے کار رہنا پڑتا ہے۔ کوئی کہتا ہے یہاں کی آدھی آبادی یعنی عورتیں کام ہی نہیں کرتیں۔ کوئی نو عمری کی شادی کی طیریا، مقدمہ بازی کے شوق وغیرہ کو ہندوستان کی غریبی کا سبب قرار دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کو عقلمندی کے ساتھ صرف کرنا نہیں جانتے۔ انھیں مناسب غذا کا علم نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ملک کی دولت جو باہر جاتی ہے اس کا پورا معاوضہ مادی شکل میں ملک کو نہیں ملتا یہ کام چونکہ عرصہ سے جاری ہے اس لئے ملک غریب ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے حکومت کی طرف سے صنعتوں کو ترقی دینے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ غرض یہ مختلف اسباب ہندوستان کی غریبی کے بیان کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے سب میں تھوڑی بہت سچائی ضرور ہے۔ لیکن معاشی زندگی نے موجودہ زمانہ میں جو شکل اختیار کر لی ہے اس کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے ہندوستان کے غریبی کے مسئلہ کو زیادہ وسیع نقطہ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ سرمایہ داری کی ترقی نے تمام ملکوں کی معاشی زندگی کو ایک ڈوری میں پرو دیا ہے۔ اب کسی ایک ملک کی غریبی کے مسئلہ پر اس دنیا سے الگ تھلگ سمجھ کر غور نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً جو لوگ ہندوستان کی زیادہ آبادی کی بہت فکر کرتے ہیں انھیں جاننا چاہیئے کہ ہندوستان اب صرف اپنی زراعتی پیداوار پر زندگی گذارنے کے لئے مجبور

نہیں رہا ہے۔ کل دنیا کی پیداوار اس کا پیٹ بھرنے کے لئے موجود ہے۔ دنیا کی مجموعی پیداوار موجودہ زمانے میں اتنی بڑھ گئی ہے یا اسے نہایت آسانی کے ساتھ اتنا بڑھایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی آبادی کو بصورت مجموعی ضرورت سے زیادہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے۔ امریکہ کناڈا، آسٹریلیا اور بہت سے دوسرے زرخیز علاقے ایسے ہیں جہاں کی آبادی ضرورت سے زیادہ نہیں ہے بلکہ ضرورت سے کم ہے۔ یورپ کے بہت سے ملکوں کی آبادی یا گھٹ رہی ہے یا ایک جگہ پر قائم ہے۔ دنیا کی منڈیاں ملکی نہیں رہی ہیں بلکہ عالمگیر ہو گئی ہیں اور ان منڈیوں میں غذا کی چیزوں کی قیمتیں بڑھ نہیں رہی ہیں بلکہ گھٹ رہی ہیں۔ اس لئے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ہندوستان کی زراعتی پیداوار یہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی نہیں ہے تو بھی اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ہندوستان کی آبادی کے لئے غذا کا مہیا کرنا مشکل یا ناممکن ہے۔ مسئلہ صرف قوت خرید کے پیدا کرنے کا ہے۔

جب اس نقطۂ نگاہ سے ہندوستان کے کروڑوں غریبوں کے مسئلہ کو دیکھا جاتا ہے تو اس ملک کے غریبوں کا مسئلہ تمام دنیا کے غریبوں کے مسئلہ کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ جو بات دوسرے ملکوں کے غریبوں کی قوت خرید کے اضافہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے وہی ہندوستان کی غریبی کو دور کرنے میں بھی حایل ہے۔ چاہے مشرق ہو چاہے مغرب چاہے صنعتی حیثیت سے ترقی یافتہ ملک ہوں چاہے زراعت پیشہ پس ماندہ ملک — مسئلہ ہر جگہ یہی ہے کہ اگر دنیا سائنس کی ایجادوں علم کی ترقیوں اور دولت کے اضافہ کے غیر محدود امکانات سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے تو اسے اپنی معاشی اور سماجی تنظیم میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرنا ہوں گی جو نئے حالات اور نئے مطالبوں کے مطابق ہوں۔ ہماری موجودہ سماجی اور معاشی تنظیم سائنس کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے رہی ہے سائنس اور سماجی تنظیم کا باہمی اختلاف اور معاشی تنظیم کا اندرونی تضاد روز بروز زیادہ پیچیدہ اور خطرناک شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہماری سماجی تنظیم ہماری معاشی ترقی کو بالکل اسی طرح روکنا چاہتی ہے جیسے کوئی شخص ایک تندرست بچے کی قدرتی نشو و نما کو ایک لوہے کا شکنجہ کس کر روکنے کی کوشش کرے۔

موجودہ معاشی اور سماجی تنظیم میں پیدائش دولت کا پورا انتظام آجروں اور ان کے ساہوکاروں کے فائدہ کے لئے چلایا جاتا ہے۔ اس میں قصداً اور ارادتاً عوام کی بہبودی کے مقصد کو نظر کے سامنے نہیں رکھا جاتا بلکہ

تاجروں اور سرمایہ داروں کے نفع کا خیال سب سے پہلے کیا جاتا ہے۔ مزدور کی اجرت یا اس کا روزگار سے لگا رہنا یا آبادی کی عام مرفہ الحالی اور بہبودی یہ چیزیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں جس وقت سرمایہ دار جن کے ہاتھ میں معاشی تنظیم کی نگرانی ہوتی ہے یہ دیکھتے ہیں کہ کسی کام میں ان کو نفع ملنے کا امکان باقی نہیں رہا ہے وہ فوراً اس کام کو بند کر دیتے ہیں۔ ان کو اس بات کی بالکل پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کے اس فیصلہ کا اثر جماعت پر کیا ہوگا، کتنی پریشاں حالی، مصیبت اور تکلیف میں لوگ مبتلا ہو جائیں گے۔ انھیں تو صرف اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ ان کی حساب کی کتابوں میں مزدوروں کی اجرت، کچے مال کی قیمت اور دوسری لاگتوں کو منہا کرنے کے بعد نفع کی رقم باقی بچتی ہے یا نہیں اگر یہ نفع باقی نہیں بچتا ہے تو ان کے نزدیک پیدائش دولت کا مقصد حاصل نہیں ہوا۔ اگر قیمتوں کی کمی کی وجہ سے وہ اپنے نفع کو کم دیکھتے ہیں تو قیمتوں کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور چونکہ قیمت رسد اور طلب کی کمی اور بیشی کے ساتھ بڑھتی گھٹتی ہے اس لئے اپنی قیمتوں کے بڑھانے کے لئے انھیں اپنی اشیا کی رسد میں مصنوعی کمی پیدا کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اور پیداوار کے ضائع کرنے کی وہ صورتیں اختیار کی جاتی ہیں جن کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس ذاتی نفع کے لالچ میں یہ خودغرض لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ جو مزدور ان کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں وہی چیزوں کے خریدار بھی ہوتے ہیں۔ اگر وہ ان کی اجرتوں کو گھٹاتے یا انھیں برطرف کرتے ہیں تو اپنے خریداروں کی قوت خرید کو کم کرتے اور اپنے مال کی بکری میں خود ہی دشواری پیدا کرتے ہیں۔ دولت کی جماعتی پیدائش اور اس پر انفرادی قبضہ زیادہ دنوں تک ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ جماعتی پیدائش کے لئے جماعتی تصرف ضروری ہے اور جماعت کے مفہوم میں کسی ایک طبقہ یا ملک کی آبادی شامل نہیں ہے بلکہ کل دنیا کی آبادی پر یہ بات صادق آتی ہے۔ دولت کو بڑے پیمانہ پر پیدا کرنے کا کام جب شروع کر دیا جاتا ہے تو پھر گاہکوں کی تلاش صرف ایک ملک تک محدود نہیں رکھی جاتی بلکہ ساری دنیا کی آبادی کو اس کے حلقہ میں شامل کرنے کا حوصلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے جب سب ملکوں کے لوگوں کے لئے روزگار مہیا کر کے ان کی قوت خرید میں اضافہ کیا جائے۔ پوری دنیا کی خوش حالی ایک دوسرے کے ساتھ قریبی طور پر وابستہ ہو گئی ہے۔ اب یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک طبقہ یا ملک تو خوش حال رہے اور دوسرے پہلے کی طرح غریب کے غریب رہیں۔ سب کو مل کر کام کرنا اور سب کو ایک ساتھ گرنا یا ابھرنا ہے۔ پیدائش

دولت کی تنظیم کے کام کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسے خودغرض لوگوں کے ہاتھ سے نکالا جائے اور ان لوگوں کے ہاتھ میں دیا جائے جو ذاتی نفع کے لئے نہیں بلکہ خدمت کے جذبہ کے ماتحت کام کریں اور ان کا مقصد چند افراد کی مرفہ الحالی اور بہبودی نہ ہو بلکہ ان کا نصب العین کل جماعت انسانی کی بہبودی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ لوگ خدمت کے جذبہ کے ماتحت اتنا ہی سخت اور مسلسل کام ایک عرصہ تک خلوص کے ساتھ جاری رکھ سکیں جتنا وہ نفع ذاتی کے لالچ کے ماتحت جاری رکھتے ہیں؟ کیا ان میں وہ نظم و ضبط اور مستعدی پیدا کی جاسکتی ہے جو بڑے پیمانہ پر کام چلانے کے لئے ضروری ہے؟ یہ انسانی سیرت اور نفسیات کے پوشیدہ امکانات کا سوال ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں اگرچہ ان کی تعداد ابھی بہت زیادہ نہیں ہے جو بے غرض خدمت اور ایثار و قربانی کی زندگی کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ عمر بھر جاری رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد کو تعلیم و تربیت اور ماحول کو پورے طور پر بدل دینے سے کس حد تک بڑھایا جاسکتا ہے یہ تجربہ سے ہی معلوم ہوسکتا ہے۔

بے روزگاری

(محمد عاقل صاحب)

بے روزگاری کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہیئے کہ کن لوگوں کا شمار بے روزگاروں میں کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے نوجوانوں کو یونیورسٹی کی ڈگریاں لینے کے بعد چونکہ اب یقینی طور پر سرکاری نوکریاں نہیں ملتیں اور کسی دوسرے پیشہ سے لگنے کے لئے نہ ان کی تربیت ہوتی ہے اور نہ ان کے پاس اس کے وسائل ہوتے ہیں اس لئے اس ملک میں بے روزگاری کا مطلب عام طور پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری لیا جاتا ہے۔ یا پھر یہ لفظ کسانوں کی بے کاری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سال پانچ مہینہ سے نو مہینہ تک کاشتکاروں کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بے کار بیٹھا رہنا پڑتا ہے۔ اس زمانہ میں اگر وہ کسی معقول کام سے لگ سکیں تو ان کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے پاس کوئی کام کرنے کے لئے نہیں ہوتا اس لئے ان کا شمار بھی بے روزگاروں میں کیا جاتا ہے بے روزگاری کی اس صورت کی طرف ہندوستان کے رہنماؤں نے خاص طور پر توجہ کرنا شروع کر دی ہے اور دیہی اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔

لیکن بے روزگاری کے جس مسئلہ کا دنیا میں چرچا ہے اور جو بڑے بڑے عالموں کو چکر میں ڈالے ہوئے ہے اس کا تعلق تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری یا کاشتکاروں کی چند مہینوں کی بے روزگاری سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صنعتی مزدوروں کی بے روزگاری سے ہے۔

آئیے اس سلسلہ میں لگے ہاتھ یہ بھی دیکھ لیں کہ آدمی روزگار سے کیوں لگنا چاہتا ہے۔ قدرت نے دنیا کا کارخانہ کچھ اس وضع کا بنایا ہے کہ محنت کئے بنا آدمی کو اس کی ضرورت کی چیزیں میسر نہیں آتیں۔ روزگار (یعنی محنت مزدوری کرنے کا وسیلہ یا موقع) آدمی صرف اس لئے ڈھونڈتا ہے کہ اسے آمدنی حاصل ہو اور وہ چین اور آرام سے زندگی بسر کر سکے۔ کھانے کو مناسب غذا ملے، رہنے کو مکان ملے، پہننے کو ایسا کپڑا ملے جو

جسم کو ڈھانپ سکے۔ سردی گرمی سے بچا سکے اور صفائی اور سلیقہ کے جس معیار کا اس کے طبقہ میں چلن ہے اُسے پورا کر سکے اور اسی طرح کی اور دوسری آرام اور راحت کی چیزیں اپنے لئے حاصل کر سکے۔ کچھ لوگ دنیا میں ایسے بھی ہیں جو خود محنت نہیں کرتے اور دوسروں سے محنت کرا کے آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ انھیں ہم یہاں بحث میں لانا نہیں چاہتے۔ انھیں اگر چھوڑ دیا جائے تو پھر ہر ملک میں آبادی کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ملے گی جسے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے محنت اور روزگار کی تلاش کرنا پڑتی ہے۔

اب چونکہ آدمی کا پیٹ ہر روز غذا مانگتا ہے اور اس کی ضرورتیں اسے روزانہ ستاتی رہتی ہیں۔ اس لئے ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے روزگار کو بھی مستقل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اگر روزگار مستقل نہ ہوا۔۔۔ ایک دن تو محنت مزدوری مل گئی اور دوسرے دن کام نہ ملا۔۔۔ تو ایک دن تو آدمی کی ضرورتیں پوری ہو جائیں گی لیکن دوسرے دن فاقہ کی نوبت آجائے گی۔ اور اگر کہیں یہ بے کاری کئی دن تک جاری رہی پھر تو آدمی کا جینا مشکل ہو جائے گا۔

دنیا کے اکثر ملکوں کی حکومتیں رعایا کے لئے روزگار فراہم کرنا اپنے فرائض میں داخل نہیں سمجھتیں اس لئے ان ملکوں میں چند سرکاری اور غیر سرکاری مستقل ملازموں کو چھوڑ کر محنت کرنے والی بقیہ آبادی کے لئے روزگار، مستقل اور یقینی نہیں ہوتا۔ لوگ عمر بھر کے لئے ملازم نہیں رکھے جاتے بلکہ صرف اس وقت تک کے لئے ملازم رکھے جاتے ہیں۔ جب تک ان کی محنت سے کارخانہ کے مالک کو نفع ملتا رہتا ہے۔ جس دن یا جس لمحہ کارخانہ کے مالک کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مزدور کے رکھنے میں اس کا کوئی نفع نہیں ہے وہ اسی وقت اس کو برطرف کر دیتا ہے۔ اس کے بعد مزدور کہاں جائے۔ کیا کرے، اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کس طرح پالے، کارخانہ کے مالک کو اس سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس خرابی کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے؟ کیا مزدوروں کے لئے روزگار کو یقینی اور مستقل نہیں بنایا جا سکتا؟ کیا انھیں بھی دوسرے سرکاری ملازموں کی طرح مستقل طور پر ملازم نہیں رکھا جا سکتا تاکہ یہ سکون اور اطمینان کے ساتھ کام کرتے ہیں اور کام کے معاوضہ سے اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کریں؟ کیا ہر مزدور کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ سرکار سے روزگار کا مطالبہ کرے اور جب اس کے لئے روزگار مہیا نہ ہو سکے تو

حکومت اس کی کفالت کی ذمہ دار بن جائے ؟

ان سوالوں کا جواب دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ موجودہ نظام میں مزدوروں کا روزگار کیوں یقینی نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں موجودہ صنعتی نظام کی تین خرابیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔

اس کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ مختلف پیشوں کے ماہروں میں پورا توازن اور اشتراک عمل پیدا نہیں کیا جاسکتا

اس کی دوسری خرابی یہ ہے کہ آئندہ کی مانگ کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا جاسکتا

اس کی تیسری خرابی یہ ہے کہ اس نظام میں روزگار کے چڑھاؤ اور اُتار کا ایک مستقل چکر برابر چلتا رہتا ہے

سب سے پہلے، پہلی خرابی کو لیجئے یعنی مختلف تجارتوں کے ماہروں میں توازن اور اشتراک عمل نہیں پایا جانا۔ صنعتوں کی نئی تنظیم کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں تقسیم عمل کو خوب ترقی ہوگئی ہے ایک مال کو ایک تنہا آدمی تیار نہیں کرتا بلکہ ہزاروں ماہر مل کر اسے تیار کرتے ہیں۔ اور ہر ماہر اپنی اپنی جگہ پر اس مال کے صرف ایک حقیر حصہ کو تیار کرتا ہے اور تیار کرکے اگلے ماہر کے سپرد کردیتا ہے جو اپنے کام کا حصہ پورا کرکے اسے پھر آگے بڑھا دیتا ہے۔ ان کاموں میں کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو ایک ہی کارخانہ کے مالک کی نگرانی اور انتظام میں کئے جاتے ہیں۔ ان میں تو توازن اور اشتراک عمل پیدا جاسکتا ہے لیکن کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو مختلف مالک اپنے اپنے کارخانوں میں کراتے ہیں اور اپنی بنائی چیز کو مصنوعہ مال کی شکل میں بازار میں فروخت کرتے ہیں۔ ایسے کاموں میں باہمی توازن قائم نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً سوتی کپڑے کو لیجئے کپاس کے پیدا کرنے والے، کپاس کو اوٹنے اور روئی کی گانٹھیں بنانے والے، روئی کو گودام میں اکٹھا کرنے والے، اسے ریل اور جہاز پر لاد کر دوسرے علاقوں میں بھیجنے والے، اس کا سوت کاتنے والے، اس کو بُننے اور رنگنے والے کارخانے بالکل علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے جداگانہ مالکوں کی نگرانی میں مال تیار کراتے اور منڈی میں پہنچاتے رہتے ہیں۔ انھیں سوتی کپڑے کے آخری خریداروں یا اپنے ذاتی مال کے خریداروں کی مانگ اور اپنے حریفوں کی پیداوار کا کوئی پختہ علم نہیں ہوتا۔ اس امید پر کہ ہمارا مال تو بک ہی جائے گا ایک طرح سے جوا کھیلتے رہتے ہیں اور چونکہ ہر شخص کو کارخانہ کھولنے کی آزادی ہے اس لئے اکثر ایسا ہوتا

ہے کہ کبھی کپاس کے کھیت زیادہ بو دیئے جاتے ہیں، کبھی روئی اوٹنے اور گانٹھ بنانے کے کارخانے زیادہ بن جاتے ہیں، کبھی روئی کے گودام زیادہ تعمیر کر دیئے جاتے ہیں، کبھی روئی کے تاجروں کی دوکانیں زیادہ کھل جاتی ہیں، کبھی ریل کی واگنیں اور جہاز زیادہ بن جاتے ہیں۔ کبھی روئی کے کاتنے والے کارخانے زیادہ ہو جاتے ہیں کبھی روئی کو بننے والے۔ غرضیکہ جب یہ تناسب بگڑتا ہے تو بہت سے کارخانے یا تو بند کر دیئے جاتے ہیں یا انہیں اپنے کام کو بہت گھٹانا پڑتا ہے اور دونوں صورتوں میں آفت مزدوروں پر آتی ہے اور انہیں بلا کسی ذاتی خطا اور قصور کے برطرف کر دیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ تقسیم عمل کی ترقی کی وجہ سے مزدوروں کو کام کے صرف ایک مخصوص حصہ میں مہارت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے وہ پرانے زمانے کی طرح ذاتی طور پر لوگوں کی ضرورت کی چیزیں بنا کر بازار میں فروخت نہیں کر سکتے نہ دوسرے پیشہ کے کاموں میں آسانی سے لگ سکتے ہیں، مجبوراً ان میں سے اکثر کو تھوڑے یا زیادہ عرصہ کے لئے بے روزگار ہو جانا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک دوسرا سبب پورے اشتراک عمل کے نہ ہونے کا یہ بھی ہوتا ہے کہ صنعت کے طریقے بھی بہت جلد جلد بدلتے رہتے ہیں۔ نئی مشینیں، نئی اشیاء خام، نئی منڈیاں، تنظیم کے نئے نئے طریقے برابر دریافت ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن مزدوروں میں چونکہ پرانے قسم کی مہارت پائی جاتی ہے اس لئے وہ نئے کام کے لئے اگر بالکل بے کار نہیں تو بہت کم مفید رہ جاتے ہیں اور انہیں نئے طریقوں سے واقفیت پیدا کرنے میں کچھ وقت صرف کرنا پڑتا ہے اور اس عرصہ کے لئے بے روزگاری کا شکار بننا پڑتا ہے۔

یہ تو مختلف تجارتوں کے ماہروں میں مناسب اشتراک عمل نہ ہونے کی وجہ سے جو بے روزگاری پیدا ہوتی ہے اس کی مثالیں ہوئیں۔ اب موجودہ نظام کی دوسری خرابی کو لیجئے یعنی اس نظام میں آئندہ کی مانگ کا ٹھیک اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

تقسیم عمل کے اس پیچیدہ نظام میں جس کا ذکر میں نے ابھی کیا، چیزیں خریداروں کی فرمائش پر پیدا نہیں کی جاتیں بلکہ خریداروں کی مانگ کے بارے میں پیش بینی سے کام لے کر چیزوں کو پیدا کیا جاتا ہے یعنی چیزیں پہلے بنائی جاتی ہیں اور ان کے خریدار بعد میں پیدا ہوتے ہیں۔ کارخانوں کے مالک ایسا کرنے کے لئے بالکل مجبور ہوتے ہیں۔ وہ کسی خاص آدمی کی فرمائش پوری کرنے کیلئے چیزیں نہیں بناتے بلکہ وہ لاکھوں نامعلوم خریدا

کے لئے ایک ہی قسم کی چیزیں تیار کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک کارخانہ کے مالک نے اس بات کا پیشگی اندازہ کیا کہ فلاں قسم کے سوت کا کپڑا اس کے گاہکوں میں خوب بک سکتا ہے تو اسے سوت کے اس کپڑے کو بڑے پیمانہ پر تیار کرنے کے لئے پہلے اپنی فیکٹری کے لئے ایک بڑی عمارت کھڑی کرنی ہوگی، کارخانے کے لئے مشینیں تیار کرانا ہوگی، کپڑے کے لئے اون یا روئی پیشگی فراہم کرنا ہوگی اور ہزاروں قسم کی اور دوسری چیزیں جن کی کپڑے کی تیاری میں ضرورت ہوتی ہے ان سب کو پہلے ہی سے فراہم کرنا پڑے گا تب کہیں جا کر یہ کپڑا تیار ہوگا۔ اب اگر اتفاق سے اس کا اندازہ غلط ہوا یا جس وقت کام شروع کیا گیا تھا اس وقت کے حالات کے مطابق تو صحیح تھا لیکن اب کپڑے کی تیاری کے بعد ریشم کے ایک اور کپڑے کے بازار میں آجانے کی وجہ سے وہ اندازہ غلط ہو گیا تو اس کا مال گوداموں میں بھرا رہے گا اور بازار میں نہ بک سکے گا یا بکے گا تو لاگت سے کم دام پر فروخت ہوگا۔ جب مال بازار میں نہ بکے گا تو یا تو اسے کارخانہ بند کرنا پڑے گا یا اپنی پیداوار کو گھٹانا پڑے گا۔ دونوں صورتوں میں اسے اپنے مزدوروں کو برطرف کرنا پڑے گا اور یہ بیچارے بغیر کسی خطا اور قصور کے بے روزگاری کا شکار ہو جائیں گے۔

موجودہ نظام صنعت کی جن دو خرابیوں کو اوپر بیان کیا گیا ان کی وجہ سے تو بے روزگاری صرف خاص خاص کارخانوں کے مزدوروں تک محدود رہتی ہے۔ لیکن تیسری خرابی یعنی کاروبار کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے بے روزگاری کا اثر بہت دور دور تک پھیل جاتا ہے۔ ہر دسویں برس یا اس کے آس پاس کے سالوں میں پلیگ، ہیضہ یا انفلوئنزا کی وباؤں کی طرح بے روزگاری کی دبا بھی پھیلتی ہے اور لاکھوں کروڑوں مزدور بغیر اپنے کسی ذاتی قصور کے خواہ مخواہ بے روزگار ہو جانے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہی بے روزگاری ہے جس کے اسباب اور علاج ڈھونڈنے سے بڑے بڑے عالم معذور نظر آتے ہیں اور جو اپنے نتیجوں کے لحاظ سے انسانی جماعت کا ایک نہایت مشکل مسئلہ بن گئی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ روزگار کی ترقی کے زمانے میں تو کاروبار کی خوب گرم بازاری ہوتی ہے۔ مزدوروں کی خوب مانگ ہوتی ہے۔ کام بہت ہوتا ہے اور مزدور کم۔ ان کو طرح طرح کے لالچ دئے جاتے ہیں۔ ان کی اجرتیں بڑھائی جاتی ہیں۔ حوصلہ، امنگ اور امید کا دور دورہ ہوتا ہے، ہر طرف چہل پہل ہوتی ہے۔ روپیہ خرچ کرنے کے ہزاروں

نئے نئے طریقے نگاہ کے سامنے ہوتے ہیں۔ ادھار پر قسطوں پر چیزیں فروخت کی جاتی ہیں۔ نقد قیمت کی ادائگی کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جاتا بلکہ ضرورت بے ضرورت ساہوکار اپنی طرف سے روپیہ ادھار دینے کے لئے ہمیشہ تیار نظر آتا ہے۔

لیکن یکبارگی عین اس وقت جب اس کا کوئی سان گمان بھی نہیں ہوتا آسمان سے غیبی گولہ گرتا ہے بنک فیل ہو جاتے ہیں۔ کارخانے بند ہو جاتے ہیں، مزدور برطرف کر دئے جاتے ہیں۔ جو باقی رہتے ہیں ان کی اجرتوں میں تخفیف کی جاتی ہے، مزدوری کی تلاش میں جہاں کہیں جاؤ کورا جواب ملتا ہے۔ کہیں سے قرض نہیں ملتا مجبوراً زندگی کے رہنے سہنے کے طریقوں کو بدلنا پڑتا ہے۔ گھر کا سامان فروخت کیا جاتا ہے، اپنا پیٹ کاٹ کر بچوں کا پیٹ بھرا جاتا ہے۔ خوراک لباس اور علاج کی کمی سے بیماری اور موت کی شرح بڑھتی ہے۔ بھیک مانگنا پڑتی ہے۔ بے شرم اور بے رحم بننا پڑتا ہے۔ عورتیں آوارگی کے پیشے اختیار کرتی ہیں، مرد چور اور ڈاکو بن جاتے ہیں۔ ایمان داری کے ساتھ کام کرنے کی عادت چھوٹ جاتی ہے۔ ایسے زمانہ میں جو اولاد پیدا ہوتی یا والدین کے ساتھ رہتی ہے وہ بھی بدترین اخلاقی خرابیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ نیک دل لوگ مزدوروں کی انجمنیں اور حکومتیں بے روزگاروں کی امداد کرنے لگتی ہیں۔ ان کے لئے عارضی طور پر سرکاری تعمیر کے کام شروع کر کے روزگار کی صورت نکالی جاتی ہے انہیں وظیفے دئے جاتے ہیں اور دعا کی جاتی ہے کہ مصیبت کا یہ زمانہ کسی طرح جلد ختم ہو جائے۔

آہستہ آہستہ کساد بازاری ختم ہوتی ہے۔ کاروبار میں دوبارہ تیزی پیدا ہونے لگتی ہے۔ پھر وہی پرانی ہماہمی اور چہل پہل نظر آنے لگتی ہے، اور کاروبار کے وہی پرانے طریقے پھر زندہ ہو جاتے ہیں اور یہ چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

لیکن بے روزگاری کا یہ دور کچھ خرابیوں کا ایسا ترکہ بھی چھوڑ جاتا ہے جن کی حیثیت مستقل ہوتی ہے اور جن کو لاعلاج سمجھنا چاہیئے۔ کچھ مزدور مناسب غذا اور آرام کے نہ ملنے سے ایسی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں مثلاً تپ دق وغیرہ جو ہمیشہ کے لئے ان کو کام کرنے سے مجبور کر دیتی ہیں کچھ مزدوروں کا دل کام کی طرف سے ہمیشہ کے لئے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ مستقل طور پر آوارہ اور جرائم پیشہ بن جاتے ہیں۔ بچوں اور نوجوانوں پر خاص طور پر اس زمانہ کے اثرات بہت خراب پیدا ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ صنعتی نظام کی ان خرابیوں کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے؟

ہم نے صنعتی نظام کی جن خرابیوں کا ابھی ذکر کیا ہے ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیادہ تر انتظام کی خرابیاں ہیں۔ تقسیم عمل کی ترقی نے لوگوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر انحصار کریں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بنائیں۔ بلکہ نجی طور پر کاروبار کو شروع کرنے کی جو آزادی لوگوں کو اس وقت ملی ہوئی ہے اس کی وجہ سے بہت بدانتظامی پیدا ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب لوگوں کو ایک مرکزی نگرانی کے ماتحت لایا جائے تاکہ ایک مناسب منصوبے اور پلین (PLAN) کے مطابق معاشی زندگی کے سب شعبوں کی تنظیم کی جا سکے۔ گاہکوں کی مانگ کا پہلے صحیح اندازہ کیا جائے اور مال اتنا ہی بنایا جائے جس کی کھپت ہو سکے۔ پھر مختلف کارخانوں کی متعلقہ پیداواروں میں بھی ایک باہمی تناسب پیدا کیا جائے تاکہ کسی چیز کے زیادہ یا کسی کے کم پیدا ہونے سے گڑبڑی پیدا نہ ہو۔ اسی طرح ملک کے زر اور اعتبار کے نظام کو بھی اس طرح چلانے کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ کاروبار کی خوب چہل پہل اور دوسری مرتبہ کاروبار میں بالکل ابتری پیدا نہ ہو بلکہ کاروبار ہمیشہ ہم آہنگی کے ساتھ چلتا رہے اور اس میں مسلسل ترقی جاری رہے۔

یہ سب کام ظاہر ہے ایک ایسا با اقتدار ادارہ ہی اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے جس کا حکم ماننے کے لئے سب لوگ مجبور ہوں یعنی یہ کام ریاست اور حکومت کے کرنے کا ہے۔ لیکن چونکہ حکومت کا انتظام چلانے والے لوگ بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور انسان کے اندازے کا ہمیشہ صحیح ہونا اور اس کے منصوبوں کا پورا ہونا بالکل یقینی نہیں ہوتا اس لئے حکومت کے افسروں کے غلط تخمینوں کے اثرات سے رعایا کو محفوظ رکھنے کے لئے بے روزگاروں کی امداد کو حکومت کے فرائض میں لازمی طور پر داخل کر دیا جائے۔ آج کل جس طرح کارخانوں کے مالکوں کے غلط تخمینوں کا خمیازہ بے چارے مزدوروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ اس کا تدارک جس قدر جلد ممکن ہو سکے کرنا ضروری ہے۔

بنک

(محمد عاقل صاحب)

کاروبار شروع کرنے اور چلانے کے لئے تھوڑی بہت پونجی کی ضرورت قریب قریب ہر شخص کو پڑتی ہے ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اپنا پورا کام اپنے روپیہ سے ہی چلا سکتے ہوں۔ اکثر صورتوں میں لوگوں کے پاس یا تو روپیہ بالکل نہیں ہوتا یا جتنا چاہیئے اتنا نہیں ہوتا۔ مثلاً کسان کو اپنا کام چلانے کے لئے ہل، بیل اور بیج کی ضرورت ہے۔ جب تک فصل تیار ہو اسے اس وقت تک کے لئے کھانے کو اناج، پہننے کو کپڑا اور دوسری ضرورتیں پوری کرنے کے لئے روپیہ چاہیئے۔ دکان دار کو کاروبار پھیلانے کے لئے سامان چاہیئے کارخانے کے لئے کچے مال مشین اور مکان کی ضرورت ہے۔ پھر مزدوروں کو مزدوری دینے، بنے ہوئے مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے اور ایسے ہی اور بہت سے دوسرے کاموں کے لئے روپیہ کی ضرورت رہتی ہے۔ روپیہ وقت پر مل جاتا ہے تو کام بن جاتا ہے۔ کاروبار میں اچھا نفع ہوتا ہے۔ نہیں تو نفع بہت کم ہوتا ہے یا گھاٹا رہتا ہے یا کاروبار بالکل بیٹھ جاتا ہے۔ روپیہ کی ضرورت اکثر صورتوں میں اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ لوگ اس وقت جتنا روپیہ لیتے ہیں آئندہ اس سے زیادہ ادا کرنے کا وعدہ کر لیتے ہیں اور کاروبار سے جو نفع ہونے والا ہوتا ہے اس کا ایک حصہ خوشی سے روپیہ قرض دینے والوں کو ادا کرنے کے لئے راضی ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف ایسے بھی بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو جتنا روپیہ کماتے ہیں وہ سب خرچ نہیں کر ڈالتے بلکہ اس میں سے کچھ بچا کر رکھ لیتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنی پونجی بڑھانے کے لئے روپیہ نہیں بچاتے بلکہ فوراً خرچ کرنے کی جگہ آہستہ آہستہ عاقبت اندیشی کے ساتھ خرچ کرنے کے لئے روپیہ پس انداز کرتے ہیں۔ ان کا مقصد دوسروں کو قرض دینا نہیں ہوتا بلکہ خود قرض کی بلا اور مصیبت سے بچنا ہوتا ہے مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کو قرض دینے کے لئے روپیہ بچا کر رکھتے ہیں اور اس سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس سے اپنی پونجی بڑھاتے ہیں پھر ان میں بھی کچھ لوگ تو چھوٹے پیمانے پر لین دین کا کام کرتے ہیں اور اپنے کسی دوسرے مستقل پیشہ کے ساتھ لین دین کے کام کو بھی ملا لیتے ہیں اور کچھ نسبتاً بڑے پیمانہ پر کام کرتے

ہیں اور لین دین کے کام کو ہی اپنا مستقل پیشہ بنا لیتے ہیں اور صرف لین دین ہی کی دکان کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان آخرالذکر لوگوں کو جن کا مستقل پیشہ لین دین ہوتا ہے بنکر اور ان کی دکان یا کوٹھی کو بنک کہتے ہیں۔

ہندوستان میں بنک کی ترقی کی تاریخ کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نہایت پرانے زمانے میں بنک کا کاروبار شروع ہو گیا تھا۔ اس کی شہادت موجود ہے کہ قرض دینے کا کام ویدوں کے عہد میں یعنی اب سے تقریباً چار ہزار سال پہلے بھی کیا جاتا تھا لیکن اس زمانے میں کسی جماعت نے اس کام کو مستقل پیشہ کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا تھا لیکن پانچویں صدی قبل مسیح سے ایسے پیشہ ور بنکروں کے بارے میں پکی شہادتیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں جو روپیہ قرض دیتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ہنڈیاں روانہ کرتے تھے۔ ان بنکروں کو سریشٹھی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ بدھ عہد کے مشہور تجارتی مرکزوں یعنی چمپا، راجہ گریہا، سراوستی، کوسامبی اور آدنتی میں بہت سے نہایت بااثر سریشٹھی یعنی بنکر رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ صرف بیوپاریوں کو ہی قرض نہیں دیتے تھے بلکہ ان تاجروں کو بھی جو سمندری سفر کر کے غیر ملکوں کو جاتے تھے یا جو جنگلوں میں قیمتی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں نکلتے تھے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ بادشاہوں کو بھی جنگ اور مالی پریشانی کے وقت یہ لوگ روپیہ قرض دیتے تھے۔ کوٹلیا کے ارتھ شاستر میں یہ تبلایا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتنی شرح سود لی جا سکتی ہے۔ دھرم شاستروں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ ارتھ شاستر اور دھرم شاستروں کے بیان میں فرق صرف اتنا ہے کہ ارتھ شاستر میں کسی خاص ذات کے لئے ساہوکاری کے پیشہ کو مخصوص نہیں کیا گیا ہے لیکن دھرم شاستروں میں یہ پیشہ صرف ویشوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

چھٹی صدی عیسوی سے سولھویں صدی عیسوی تک بنک کے کاروبار کا کوئی مسلسل حال نہیں ملتا۔ البتہ بارہویں صدی عیسوی میں ہنڈیوں کے رواج کی شہادت ملتی ہے۔ اس کے بعد مسلمان مورخوں کی تصنیفوں مثلاً برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ملتانیوں اور صرافوں کا نام آتا ہے جو نہ صرف تجارتی مرکزوں کو روپیہ فراہم کرتے تھے بلکہ ابتدائی مسلمان بادشاہوں کو روپیہ کی جو ضرورت ہوتی تھی اسے بھی پورا کرتے تھے۔ مغلوں کے عہد میں آئین اکبری اور ٹیورنیر کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیسی

ساہوکار روپئے کے لین دین کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرتے تھے اور ان کے کاروبار میں درشنی اور میعادی ہنڈیوں کو بہت اہمیت حاصل تھی حکومت کی طرف سے ان ساہوکاروں کو محصل، خزانچی اور صراف کے عہدوں پر مقرر کرنے کا رواج بھی بہت عام ہو گیا تھا اور قدرتی طور پر ان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا تھا سترھویں اور اٹھارویں صدی کے جگت سیٹھوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اثر و اقتدار کے لحاظ سے دنیا کے بڑے سے بڑے بنک کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

لیکن انگریزی سلطنت کے قائم ہونے سے دیسی بنکروں کی اہمیت کم ہونا شروع ہو گئی اور مغربی طرز کے بنک ہندوستان میں قائم ہونے لگے۔ لیکن ابھی تک ہندوستان میں مغربی طرز کے بنکوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ دیسی بنکوں، ساہوکاروں صرافوں اور مہاجنوں سے لین دین کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے اور دیہاتوں میں خصوصیت کے ساتھ ان کا ہی پورا عمل دخل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ مغربی طرز کے بڑے بنکوں سے براہ راست لین دین نہیں کر سکتے ان کے لئے بھی دیسی ساہوکار، دلال اور درمیانی آدمی کا کام انجام دیتے ہیں۔

مغربی طرز کے بنکوں اور دیسی بنکوں میں فرق یہ ہے کہ دیسی بنک کا کام چھوٹے پیمانہ پر ہوتا ہے اور مغربی بنک کا بڑے پیمانہ پر۔ دیسی بنک اور ساہوکار زیادہ تر اپنے ذاتی یا خاندانی سرمایہ سے کام کرتے ہیں اور مغربی طرز کے بنک مشترکہ سرمایہ سے اپنا کام چلاتے ہیں۔ دیسی بنک میں امانتیں رکھنے کا رواج یا تو بالکل نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے اور جو امانتیں رکھی جاتی ہیں ان میں بھی ایسی امانتیں جن پر بیاج دیا جائے بہت کم ہوتی ہیں یعنی ان امانتوں کو کاروبار میں لگانے کی اجازت نہیں ہوتی بلکہ صرف حفاظت کے لئے رکھائی جاتی ہیں۔ مغربی طرز کے بنکوں میں امانتوں کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے اور لوگ امانتوں پر بیاج بھی چاہتے ہیں اس لئے یہاں امانتوں کو کاروبار میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔

بنک کے بارے میں ان ابتدائی باتوں کو بیان کرنے کے بعد اب ہم دیکھیں گے کہ بنک کے کام کیا کیا ہوتے ہیں۔ مغربی طرز کے بنکوں کے دو نہایت اہم کام ہوتے ہیں۔ ان کا پہلا کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا کاروبار چلانے کے لئے لوگوں کا روپیہ امانت رکھتے ہیں اور ان کا دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ یہ کاروباری لوگوں کی مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے بنک سے روپیہ قرض دیتے ہیں۔ ان کے اور دوسرے بھی کام ہوتے ہیں لیکن یہ کام نہایت

اہم اور ضروری ہیں۔ بنکوں کو اپنے ان کاموں سے نفع اس طرح ملتا ہے کہ یہ کم شرح سود پر روپیہ امانت رکھتے ہیں اور زیادہ شرح سود پر کاروباری لوگوں کو قرض دیتے ہیں اب ہم ان دونوں کاموں کے بارے میں ذرا تفصیل کے ساتھ کچھ باتیں بیان کریں گے۔

جو لوگ اپنا روپیہ بنک میں امانتاً رکھنا چاہتے ہیں بنک والے ان کے لئے عموماً دو طرح کے حساب کھولتے ہیں ایک کو امانت کا حساب کہتے ہیں اور دوسرے کو چالو حساب کہتے ہیں امانت کے حساب سے روپیہ واپس لینے کے لئے امانت رکھنے والے کو ایک ہفتہ، ایک مہینہ تین مہینہ یا چھ مہینہ پہلے اطلاع دینی ہوتی ہے جس سے یہ فائدہ ہے کہ بنک امانت کا روپیہ اطمینان سے کاروبار میں لگائے رکھتا ہے اور اطلاع ملنے پر ضروری رقم کاروبار سے نکال کر واپسی کے واسطے مہیا کر لیتا ہے اور وقت آنے پر ادا کر دیتا ہے۔ امانت کے حساب کا روپیہ واپس لینے کے لئے چونکہ کچھ عرصہ قبل اطلاع دینی شرط ہے اس لئے اسے دوسرے لوگوں کو اطمینان سے قرض دیا جاسکتا ہے اور جو کچھ بطور سود بنک کو حاصل ہو اس کا ایک حصہ امانت کی رقم جمع کرنے والے کو بھی دیا جاتا ہے۔ اور اطلاع کی میعاد جس قدر وسیع ہو امانت کے حساب کا روپیہ زیادہ مستقل کاروبار میں لگ سکتا ہے اور امانت رکھنے والے کو زیادہ شرح سود دی جاسکتی ہے۔

دوسرا حساب چالو حساب کہلاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جمع کیا ہوا روپیہ واپس لینے کے واسطے پہلے سے کوئی اطلاع دینی ضروری نہیں جس وقت جتنا چاہیں روپیہ واپس لے سکتے ہیں چونکہ چالو حساب کے لئے روپیہ کی کثیر مقدار کو ادائگی کے واسطے ہر وقت تیار رکھنا پڑتا ہے اور اس کا کاروبار میں لگانا خلاف احتیاط ہے اس لئے اس حساب میں جمع کرنے والوں کو بنک کوئی سود نہیں دیتے۔ مگر چالو کھاتے میں بھی لوگ بہ کثرت اس وجہ سے روپیہ جمع کرتے ہیں کہ اول تو اس کی حفاظت کی فکر سے آزاد ہو جاتے ہیں دوسرے بنک مفت خزانچی کا کام دیتا ہے اور روپئے کے لین دین میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔

چالو کھاتے میں روپیہ جمع کرنے والوں کا تو اس سے فائدہ سمجھ میں آگیا لیکن بنک کو خود چالو حساب کھولنے سے کیا فائدہ ہے اس کا بیان کرنا باقی رہا۔ امانت کے حساب میں روپیہ تو بنک اس لالچ سے لیتے ہیں کہ اس سے کاروبار چلا کر سود پاتے ہیں جس کا ایک حصہ جمع کرنے والے کو دے کر باقی خود اڑاتے ہیں مگر

چالو حساب تو سوا بے کار پڑے رہنے یا واپس ہونے کے اور کسی کام آتا ہی نہیں ورنہ اس پر بنک کو کچھ سود ملتا ہے پھر وہ خواہ مخواہ کی اس دردسری کو اپنے ذمہ کیوں لیتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چالو حساب کا سب روپیہ بے کار نہیں پڑا رہتا بلکہ صرف ایک حصہ بے کار رہتا ہے اور باقی کاروبار میں لگا دیا جاتا ہے۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاروبار میں روپیہ لگا دینے کے بعد چالو حساب رکھنے والوں کے مطالبوں کو بنک کس طرح پورا کرتا ہے۔ اس کا اندازہ چک کے اصول کو سمجھنے سے ہوگا۔ جو لوگ بنک کے چالو کھاتے میں روپیہ جمع کرتے ہیں انھیں روپیہ واپس لینے کے لئے بنک سے مطبوعہ فارموں کی کاپیاں ملتی ہیں جن کی باقاعدہ خانہ پری کرکے حسب ضرورت رقم واپس لی جاتی ہے۔ یہی فارم چک کہلاتے ہیں۔

چک روپیہ جمع کرنے والوں کی طرف سے بنک کے نام ایک حکم ہوتا ہے کہ ہمارے حساب میں سے فلاں رقم ہم کو یا فلاں شخص کو یا حامل ہذا کو ادا کردو۔ بنک چک لکھنے والے کی تحریر اور دستخط سے اس کی صحت کا اطمینان کرکے اور چک کی پشت پر روپیہ لینے والے کے دستخط کرا کے لکھی ہوئی رقم ادا کرتا اور چک بطور رسید رکھ لیتا ہے۔ اب روپیہ جمع کرنے والے کی سہولت کا اندازہ کیجئے اس کو صرف ایک چکوں کی کتاب رکھنا پڑتی ہے اور جب جتنا روپیہ لینا یا کسی کو دینا منظور ہو فوراً بنک کے نام چک لکھ دیتا ہے اور اس کا کام بن جاتا ہے۔

کسی ملک میں بنک کے رواج ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اپنا پس انداز کیا ہوا روپیہ بنک میں رکھیں۔ جو لوگ خود کوئی کاروبار چلانا نہیں چاہتے وہ تو اپنا روپیہ بطور امانت جمع کرتے ہیں تاکہ سود بھی ملتا رہے مگر جو لوگ کاروبار میں مصروف ہیں وہ بھی اپنا روپیہ بنک کے چالو کھاتے میں رکھتے ہیں۔ بنک بلا معاوضہ ان کا خزانچی بن جاتا ہے اور چک کے ذریعہ روپیہ کی ادائگی اور وصول یابی میں بے حد سہولت ہوتی ہے۔

اگر ایک سادہ مثال سامنے رکھی جائے تو بات جلد سمجھ میں آجائے گی۔ فرض کرو کسی شہر میں صرف ایک بنک ہے اور وہاں کے سب تاجر چالو کھاتے میں اپنی اپنی طرف سے کافی رقمیں جمع کر دیتے ہیں۔ اب ان میں سے کوئی اپنے پاس سے کسی کو نقد رقم ادا نہیں کرے گا بلکہ جب کوئی کسی کو روپیہ دینا چاہے گا اس کے لئے چک لکھ دے گا جس کے پیش کرنے پر درج کی ہوئی رقم بنک ادا کر دے گا۔ لیکن بنک سے نقد

روپیہ لینے کی نوبت کم آئے گی۔ کیونکہ ان تاجروں میں سے جن کا بنک کے چالو کھاتہ میں حساب کھلا ہے جب کوئی کسی کے لئے چک لکھے گا تو لکھی ہوئی رقم ایک کے حساب سے دوسرے کے حساب میں منتقل کردی جائے گی یعنی چک لکھنے والے کی طرف سے ادائگی اور چک پانے والے کی طرف سے وصول یابی بنک کے حساب وکتاب میں درج کردی جائے گی اور یہ سب تحریری کارروائی ہوگی اور بنک کے نقد روپیہ پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔ صرف چک میں لکھی ہوئی رقم اس کے لکھنے والے کے حساب سے خارج کرکے اس کے پانے والے کے حساب میں درج ہو جائے گی۔ اس طرح پر یہ سب تاجر لاکھوں روپیہ کی تجارت کرتے رہیں گے مگر بہت کم روپیہ نقد استعمال کرنے کی نوبت آئے گی صرف چکوں کی رقمیں بنک کے رجسٹروں میں ادھر سے ادھر گھومتی رہیں گی۔

اب اگر بنک ایک کی جگہ دو یا زیادہ ہوں اور ان میں آپس میں یہ سمجھوتہ ہوجائے کہ ایک بنک دوسرے بنک کے چکوں کو قبول کرتا رہے گا تو اول تو بہت سے چکوں کی رقم برابر ہونے کی وجہ سے حساب بیباق ہوجائے گا اور اگر کچھ زائد مطالبہ باقی رہیگا تو صرف اتنا ہی ایک دوسرے کو ادا کرنا پڑے گا۔

اس سے پتہ چلا کہ بنک امانت کے حساب کے کل روپیہ اور چالو کھاتہ کے ایک حصہ کو طرح طرح کے کاروبار میں لگا کر خوب سود وصول کر سکتے ہیں۔ لیکن انہیں اس بات کی عموماً احتیاط کرنا پڑتی ہے کہ چالو کھاتہ کا روپیہ ایسے کاروبار میں نہ لگایا جائے جس کے وصول ہونے میں دیر لگنے کا اندیشہ ہو ورنہ لوگوں کا اعتبار جاتا رہے گا اور بنک کا دیوالہ نکل جائے گا۔

اب تک تو ہم نے یہ بات بیان کی کہ اپنے کاروبار کو پھیلانے کے لئے بنک روپیہ کہاں سے حاصل کرتے ہیں اس سلسلہ میں ہم نے بتلایا کہ ایک تو امانت کے حساب میں بنک اپنے یہاں روپیہ جمع کرتے ہیں دوسرے چالو کھاتے میں جمع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تیسرا کھاتہ سونگ بنک کے حساب کا بھی ہوتا ہے۔ چوتھے ایسی رقمیں بھی ہوتی ہیں جو بنک کی معرفت لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا چاہتے ہیں بنک کے پاس لوگوں کا زیور وغیرہ بھی حفاظت کیلئے رکھا جاتا ہے یا روپیہ کمپنی کے حصہ خریدنے اور دوسرے مختلف کاروبار میں لگانے کے لئے آتا رہتا ہے۔ بہرحال یہ تو اس کی آمدنی کے مختلف ذرائع ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا

چاہیئے کہ بنک کس قسم کے کاروبار میں اپنا روپیہ لگاتا ہے یعنی کن لوگوں کو کن کن شرطوں کے ساتھ روپیہ قرض دیتا ہے۔

جن کاموں میں بنک روپیہ لگا سکتے ہیں وہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ان مختلف کاموں کی وجہ سے بنکوں کے نام بھی الگ الگ ہو گئے ہیں۔ جو بنک زمین کو رہن رکھ کر بہت برسوں کے لئے روپیہ قرض دیتے ہیں وہ رہنی بنک کہلاتے ہیں۔ جو زراعت کی ضرورت کے لئے روپیہ دیتے ہیں اور یہ روپیہ بھی زیادہ مدت کے لئے دیا جاتا ہے وہ زراعتی بنک کہلاتے ہیں۔ جو نئے صنعتی کارخانوں کے قائم کرنے یا پرانے کارخانوں کے پھیلانے کے لئے روپیہ دیتے ہیں وہ صنعتی بنک کہلاتے ہیں اور جو تجارت کی آسانی یعنی مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے یا مال کو ایک وقت بچا کر دوسرے وقت بیچنے کے لئے روپیہ دیتے ہیں وہ تجارتی بنک کہلاتے ہیں ان کے علاوہ اور بھی بنک ہوتے ہیں جیسے رہنو بنک امداد باہمی کے بنک مبادلہ کے بنک، ہنڈیوں کے دلال، بٹہ گھر، قبولیت گھر وغیرہ۔

بہرحال ان بنکوں میں جن بنکوں کی بہت زیادہ کثرت ہے اور جو ایک حد تک ان میں سے بہت سے کاموں کو اپنے اصل کام کے ساتھ ملا بھی سکتے ہیں وہ تجارتی بنک ہیں۔ ان بنکوں میں اپنے گاہکوں کو قرض دینے کی عام صورت یہ ہوتی ہے کہ جو تاجر بھروسہ کے ہوتے ہیں ان کی ہنڈیاں بٹہ کے ساتھ خریدی جاتی ہیں۔ ہنڈی، بٹہ، سکارنا اور خریدنا یہ اصطلاحیں ایسی ہیں جنھیں لوگ عام طور پر جانتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کو سمجھانا ضروری تھا مگر گنجائش کی تنگی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے۔

اوپر کی تمام بحث سے یہ ظاہر ہوا کہ کس طرح بنک کے ذریعہ سے روپیہ بچانے والے اور روپیہ قرض لینے والے بنک کی معرفت ایک دوسرے سے نزدیک آجاتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ہمارے دیس ہندوستان میں بنک بہت کم ہیں جبکہ امریکہ میں بنکوں کی تعداد ۱۹۲۱ء میں ۲۲ ہزار ا، تھی ہندوستان میں صرف ۸۰۰ بنک پائے جاتے تھے۔ امریکہ کے بنک میں امانتیں فی کس ایک ہزار ۱۲۳ روپیہ کی تھیں لیکن ہندوستان میں یہ رقم صرف ساڑھے چھ روپیہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں صنعت و حرفت تجارت اور زراعت نے جتنی چاہیئے اتنی ترقی نہیں کی ہے جو کچھ میں نے اس وقت بیان کیا ہے بنک کے کام کی صرف ایک جھلک سمجھئے بہرحال پھر کبھی اس سے زیادہ بہتر اور مفصل طریقہ پر سنیئے گا۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

ایک زمانہ تھا جب ہر ملک کی سیاست کا اپنا الگ چشمہ یا دریا تھا، جو کسی ایک طرف اپنے خاص زور سے بہا کرتا تھا اب دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ یہ سب دریا مل کر ایک بہت بڑا دھارا بن گئے ہیں جس کے کناروں پر سمجھئے ہم سب آباد ہیں۔ کبھی یہ دھارا خاموشی سے چلتا ہے کبھی کناروں کی ٹکر یا پانی کے زور سے اس میں بھنور پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر دنیا کا وہی حال ہوتا ہے جو آدمی کے گلے میں پھندا اڑ جانے سے جب تک یہ بھنور رہتا ہے، لوگ بہت پریشان رہتے ہیں اس لئے کہ دریا کا بہاؤ بہت تیز ہو جاتا ہے اس کے کنارے کٹ کٹ گرنے لگتے ہیں اور پوری بستیوں کے بہ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

اس وقت سیاست کے دریا میں دو بھنور ہیں ایک تو ہسپانیہ اور دوسرا چین ان کے علاوہ ایک اور بھنور تیزی کے ساتھ ہلتا دکھائی دیتا ہے، اور وہ پولینڈ کی آٹنی آبادی کا معاملہ ہے بارسلونا کی فتح کے بعد سمجھئے کہ ایک گرہ تو کھل گئی یعنی ہسپانیہ کی خانہ جنگی اب ختم ہونے کو ہے اس سے لوگوں کو اطمینان ہونا چاہئے تھا لیکن لوگوں کو دیکھئے اور زیادہ گھبرائے ہوئے ہیں۔ شاید چین کی لڑائی ختم ہو تب بھی لوگ خوشی منانے کے بجائے اپنی اپنی خیر منائیں گے۔ یہ بات تو الٹی ہے مگر بے سبب نہیں

ہسپانیہ میں اب تک دو فریق ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے اور یورپ کی بعض قومیں اس لڑائی میں حصہ لے رہی تھیں بعض الگ تھیں۔ اب جنرل فرانکو جیت گئے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ساتھیوں کی جیت ہوئی۔ ایک معاملہ جو اب تک ہسپانیہ کا معاملہ تھا۔ یورپی سیاست کا بہت ہی نازک مسئلہ بن گیا ہے۔ جنرل فرانکو کی خواہش تھی کہ تھوڑا تھوڑا ملک فتح کریں اور کمیونزم کے فساد سے پاک کر کے پھر آگے بڑھیں اس طریقہ میں ایک خاص فائدہ یہ بھی تھا کہ جنگ کی حالت قائم رہتی جنرل فرانکو کے تمام اختیارات محفوظ رہتے

ان کی پارٹی ان کے قابو میں رہتی۔ اور توپوں کے سوا سب کا منہ بند رہتا۔ لیکن یہ طریقہ سنیور سولینی کی مصلحت کے خلاف تھا انھیں ہسپانیہ بھیجنے کے لئے سپاہی مل جاتے تھے اٹلی میں جو سامان جنگ تیار ہوتا رہتا ہے اس کی نکاسی کی ایک صورت بھی تھی مگر اس طرح کے لین دین کی ایک حد ہوتی ہے اور سنیور سولینی نے اب محسوس کیا کہ وہ بہت کچھ دے چکے ہیں اور دام وصول کرنے کا وقت آگیا ہے اس وجہ سے انھوں نے فرینکو پر زور ڈال کر بارسیلونا فتح کر دیا اور اب یورپ والے اس فکر میں ہیں کہ دیکھئے وہ کیا مانگتے ہیں اور انھیں کیا دینا پڑتا ہے جنرل فرینکو تو خیر ان کے قرض دار ہیں اور انھیں کی مدد سے جیتے ہیں وہ جو کچھ دینے پہ تیار ہوں کم ہے لیکن ان کے پاس دینے کو کیا ہے پھر دوسری مشکل یہ ہے کہ وہ جو کچھ دیں گے اس پر فرانس انگلستان کو اعتراض ہوگا یہی سوچ کر سنیور سولینی نے پہلے ہی سے ٹیونس کورسکا اور جبوتی کا لمبا چوڑا اور صریحاً بے تکا مطالبہ پیش کر دیا ہے فرینکو کی مدد کرنے سے سنیور سولینی کو ہرگز یہ حق نہیں ہو جاتا کہ فرانس کے پاس جو کچھ ہے اسے چھین لیں۔ لیکن اس وقت ان کی فوجیں ہسپانیہ میں ہیں فرینکو سے ان کی گاڑھی دوستی ہے میجورکے جزیرے پر ان کا قبضہ ہے اور ایک اندھا دھند مطالبہ کرنے میں ان کا مقصد یہ ہے کہ کہیں سے کچھ مار مریں یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اصل میں وہ کیا چاہتے ہیں اور اگر اس وقت کوئی برطانیہ اور فرانس کی وزارت خارجہ کو ٹھیک ٹھیک بتا دے کہ سنیور سولینی کیا ارادے رکھتے ہیں تو اسے اچھا خاصا انعام مل سکتا ہے۔ سنیور سولینی نے فرانس کو گھبرا لیا ہے لیکن وہ فرانس سے اکیلے لڑ نہیں سکتے اور سب جانتے ہیں کہ وہ ہٹلر کے سہارے کے بغیر کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اس لئے لوگوں کو ہر ہٹلر کی اس تقریر کا جو ۳۰ جنوری کو ہوئی بہت انتظار تھا۔ مگر وہ اپنی پچھلی کرامات بیان کر کے رہ گئے یہ نہیں بتایا کہ اب کون سے کرشمے دکھائیں گے اور وہ بتاتے بھی کیوں۔ ہماری آپ کی طرح وہ بھی جانتے ہیں کہ ایسی باتیں پہلے سے بتائی نہیں جاتیں۔ اصل میں ہر ہٹلر خود اس تاک میں ہیں کہ سنیور سولینی کچھ کر بیٹھیں تو اس سے مناسب فائدہ اٹھایا جائے اسی خیال سے وہ سنیور سولینی کو برابر شہ دے رہے ہیں جرمن اخبار اس وقت سے جبکہ مس کورسیکا ٹیونس اور جبوتی کا مطالبہ پیش ہوا ہے یہ کہ رہے ہیں کہ اٹلی کو اس کا حق ملنا چاہیئے۔ فرانس کے وزیر خارجہ موسیو بونے کے دریافت کرنے پر انھیں یہ بتایا گیا کہ جرمنی کا اس سے ابھی شروع دسمبر میں جو معاہدہ ہوا ہے اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ جرمنی ہر جھگڑے میں فرانس

کا ساتھ دے گا اور اس میں کوئی شک نہ ہونا چاہیئے کہ جرمنی کو ہمدردی اٹلی سے ہے اس جواب سے فرانسیسیوں کو مایوسی ضرور ہوئی لیکن اس کا بھی خیال رکھئے سینور مسولینی بھی پھنس گئے ہیں یعنی انھیں بہت جلد طے کرنا ہوگا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور اسے جلد سے جلد وصول کرنے کی تدبیر کرنا ہوگی ان کی فوجیں اب مہینے دو مہینے سے زیادہ ہسپانیہ میں رہیں تو ہسپانی خود بگڑ جائیں گے اور اگر یہ فوجیں ہٹائی گئیں تو پھر فرانس اور انگلستان پر کسی دھمکی کا اثر نہ ہوگا۔ انگلستان سے اس وقت ان کی جو دوستی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح معاملے کو ایسی صورت دی جائے کہ اٹلی اور فرانس دو مخالف فریق اور برطانیہ ان کے درمیان پنچ بن جائے اس کوشش میں ہر ہٹلر اپنی طرف سے یہ کر رہے ہیں کہ اٹلی کے مطالبوں کے ساتھ جرمن کی نوآبادیوں کا مطالبہ بھی پیش کر دیا ہے، اس امید میں کہ برطانیہ اپنی گردن سے پھندا نکال کر فرانس کے گلے میں ڈال دے گا یہ ہوگیا تو پھر کیا کہنے ہیں بڑی موٹی اسامی پھنسے گی۔

لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ فرانس میں موسیو بونے اور انگلستان میں سر سیمویل ہور نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ جنگ کے لئے تیار ہیں، ایسے تیار کہ دنیا کی کوئی ریاست انھیں شکست نہیں دے سکتی۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی جتا دیا گیا ہے کہ لڑائی ہوئی تو برطانیہ اور فرانس کے درمیان پورا اتحاد عمل ہوگا۔ فرانس اور برطانیہ کے ان اعلانوں سے منشا یہ ہے کہ سینور مسولینی احتیاط سے قدم بڑھائیں اور اس کے علاوہ وہ اس کو ہر ممکن کوشش کریں گے کہ دو تین مہینے تک لڑائی کی کوئی صورت پیدا نہ ہو اس عرصے میں انھیں امید ہے کہ جنرل فرانکو سمجھ جائیں گے کہ اگر وہ اپنے قرضے کی ادائگی سے اور سینور مسولینی کے پنجے سے چھوٹنا چاہتے ہیں تو انھیں برطانیہ اور فرانس کے سامنے جھکنا چاہیئے یہ چال خود جنرل فرینکو کو نہ سوجھی تو ان کی پارٹی کے لوگ انھیں سوجھا دیں گے بشرطیکہ انھیں موقعہ ملا اور برطانیہ اور فرانس انھیں اس کا پورا موقعہ دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس میں کامیاب ہوئے تو سنیور مسولینی کی بڑی جگ ہنسائی ہوگی اور ان کی سیاست ایسی ڈبکی کھا گئی کہ پھر شاید ابھر نہ سکے ان کی چار برس کی جوڑ توڑ کے باوجود جرمنی اور آسٹریا کا اتحاد ہوگیا۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے بدلے جرمنی نے اٹلی کو جنوب مشرقی یورپ سے کھسکا دیا۔ اور ہسپانیہ میں بھی چپکے چپکے ایسا سودا کیا کہ اسے بہت کچھ مل گیا اور اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا جا سکتا اب سمجھئے سنیور مسولینی کو آخری موقعہ ہے۔ وہ کچھ

مارے گئے تو خیر ورنہ پھر انھیں یا تو حکومت اور ریاست سے علیحدہ ہونا پڑے گا جو کہ ان کے لئے موت سے بھی بدتر ہے، یا کسی طرح قلابازی کھا کر جرمنی کا پہلو چھوڑ برطانیہ کی گود میں پہنچنا ہوگا مسٹر چیمبرلین تو گود پھیلائے چھتری لگائے گھومتے ہی ہیں وہ سنور مسولینی کو بڑے شوق سے گود میں بٹھا لیں گے۔

ہر ہٹلر کی سیاست کا حال یہ ہے کہ وہ ایسی کایا پلٹ کے لئے بھی تیار ہیں مغربی یورپ میں کہیں داؤ نہ چلا تو وہ مشرق میں کہیں پر وار کریں گے کئی سال ہوئے انھوں نے پولینڈ سے تعلقات بڑھا کر اسے فرانس اور برطانیہ سے علیحدہ کیا اور روس سے بچنے کے لئے ایک آڑ بنایا یہ دوستی اب تک قائم ہے پولینڈ اور جرمن کے سفیروں اور وزیروں کی ملاقاتیں اب پہلے سے بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ جرمن سیاست نے پولینڈ کو ہنگری سے خفا کر دیا ہے، اور ہنگری کو سلوواکیا سے ابھی کچھ دن ہوئے لڑا بھی دیا۔ تاکہ مشرقی چیکوسلواکیا جو میونخ کانفرنس کے بعد سے کارپتھو اوکرائن کہلاتا ہے نہ ہنگری میں شامل ہو سکے اور نہ پولینڈ میں۔ اور یہ دونوں آپس میں اسے بانٹ بھی نہ سکیں شمال میں جرمنی کا میمل کے شہر پر قبضہ ہونے والا ہے اور ایسا ہو گیا تو پولینڈ بالکل جرمنی کے قابو میں ہو جائے گا لطف تو یہ ہے کہ جرمنی روس سے بھی سمجھوتا کرنے والا ہے اور اس کے لئے زمین تیار کرنے کی غرض سے اس نے کہا ہے کہ وہ اپنے معاہدوں کے ان حصوں کو جن میں کومیونزم کے خلاف جنگ کرنے کی نیت ظاہر کی گئی ہے ملتوی قرار دے گا یعنی جرمنی کی تحریک پر اٹلی اور جاپان اور حال ہی میں ہنگری نے کومیونزم کے خلاف جو اتحاد کیا ہے اس کا ڈنک نکل جائے گا روس اور پولینڈ کے درمیان تو ایک معاہدہ ابھی ہو چکا ہے جرمنی اس میں شریک ہو جائے گا اور کسی سے بگاڑے بغیر روس سے بنائے گا۔

اس میں بھید یہ ہے کہ ہر ہٹلر اوکرائن کے اس حصے کو اپنے چنگل میں کرنا چاہتے ہیں جو جنگ عظیم کے بعد پولینڈ میں شامل ہو گیا تھا۔ اوکرائن کے دو حصے اور ہیں جن میں ایک روسی ریاست میں ہے اور دوسرا رومانیہ میں ملا دیا گیا ہے پولینڈ کے اکرائنی تعداد میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہیں حکومت امن کے ساتھ واقعی بہت برا برتاؤ کرتی ہے اگرچہ . . . . جب اسے اکرائنی علاقہ دیا گیا تھا تو پولینڈ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اکرائنوں کو سوراج دے گا اس نے پوری کوشش کی ہے کہ اکرائنی سوراج کے قابل نہ رہیں۔ ان

کے اسکول بند کر دئے ہیں انہیں ملازمتوں سے الگ رکھا ہے۔ اور انہیں کسی حق اور کسی طرح کی آزادی کے لائق نہیں مانا ہے ایسے ظلم کی مخالفت کی جائے تو اسے کون غلط یا برا کہہ سکتا ہے۔ اور ہر ہٹلر اگر اکرائنو کا حق دلوانا اپنے ذمے لیں تو ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا ابھی تک وہ کھلم کھلا کچھ نہیں کہہ رہے ہیں لیکن پچھلے دسمبر میں پولینڈ کی پارلیمنٹ میں اکرائنی سوراج کا ایک بل پیش ہو چکا ہے جن میں قریب قریب وہی مطالبے ہیں جو چکوسلواکیا کی جرمن آبادی کی طرف سے شروع، شروع میں ہر ہنلائن نے کئے تھے اوکرائنی قوم بڑی بہادر اور جنگجو ہے اگر کہیں لڑائی چھڑ گئی تو پھر کیا ہے ہر ہٹلر پنچ بن جائیں گے اور یا تو کسی کو صلح کرانے کے لئے بھیج کر جیسا کہ مسٹر چمبرلین نے لارڈ رنسی کو بھیجا تھا یا پولینڈ پر دباؤ ڈال کر دیسا ہی فیصلہ کرینگے۔ جیسا کہ مسٹر چمبرلین نے چکوسلواکیا کے معاملے میں کرایا تھا برطانیہ اور فرانس جنھوں نے چکوسلواکیا کو بچانے کی کوشش نہیں کی بھلا پولینڈ کی خاطر کیوں کچھ کریں گے رہا روس سو اس کو تو برطانیہ اور فرانس ایسا دتکار چکے ہیں کہ وہ ان کے پاس نہ پھٹکے گا۔ اور پولینڈ کے قبضے سے اوکرائن نکل گیا تو اس میں اس کا اتنا نقصان نہیں جتنا کہ جرمنی سے لڑنے میں پولینڈ سے دوستی قائم رکھنے میں جرمنی کا فائدہ یہ ہے کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے گی پولینڈ پر ویسا ہی دباؤ ڈالا جا سکے گا جیسا کہ برطانیہ اور فرانس نے چکوسلواکیا پر ڈالا تھا اور جرمن کے لئے نتیجہ اتنا ہی مفید ہوگا

جہاں سیاست کی اتنی گہری چالیں چلی جا رہی ہوں وہاں بازی کا بگڑ جانا اور مخالفوں کا ایک دوسرے سے لڑ جانا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن وہی لوگ جو جنگ کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ فروری مارچ کے مہینے لڑنے کے لئے موزوں نہیں۔ آپ شاید اس سے مطمئن نہ ہوں ہمارے خیال میں تو یہ دو مہینے بھی غنیمت ہیں دنیا بہتیروں کو اتنی مہلت بھی نہیں دیتی۔

مطبوعات موصولہ

۱۔ مذہبی کتابیں

حسن بیان | یہ قرآن پاک کا ترجمہ ہے جو جناب غلام حسن نیازی صاحب پشاوری نے خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم کی فرمائش پر کیا تھا۔ اس میں مطالب قرآن بھی مختصر طور پر شامل ہیں۔

فلسفہ تعلیم اسلام (جلد اول) | از جناب سید حمید صاحب شاہی امام جامع مسجد دہلی۔ مصنف نے اس کتاب کے سبب تالیف کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے "ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس کے مطالعہ سے عقاید واحکام اسلامیہ کے خط وخال کی رعنائی، علوم حاضرہ اور کشفیات جدیدہ کی روشنی میں۔ زیادہ روشن اور زیادہ واضح نظر آنے لگے"

۱۔پاک زندگی
۲۔صلواۃ وسلام | از مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند۔ رسالہ "صلوٰۃ وسلام" مولانا کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے "جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ مقدس ومطہر میں درود وسلام پیش کرنے کے سلسلہ میں کی گئی تھیں اور رسالہ "پاک زندگی" مولانا کے تین مضامین (فطرت سلیمہ، حیات طیبہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کا مجموعہ ہے۔

تراجم علمائے حدیث ہند جلد اول | مؤلفہ جناب ابو یحیٰی امام خاں صاحب نوشہروی اس میں "خاندان ولی اللہی دہلی وعلمائے دہلی وصوبہ یوپی مرحومین وموجودین کے تراجم ہیں" اس کتاب کے لئے علامہ سید سلیمان ندوی صاحب نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔

اسلام اور عروج سائنس وتمدن | مصنفہ مولوی عبدالکریم صاحب بی۔ اے۔ ایم۔ ایل۔ سی مترجمہ شیخ عبدالمجید صاحب بی۔ اے۔ اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "اسلام ترقی سائنس کا جو تمدن کا جزو لاینفک ہے مانع نہیں ہے ......عہد سلف کے مسلمان، جدید سائنس وتمدن کے رہنما اور مصلح ہیں۔ زمانہ مابعد میں اسلامی دنیا پر جو ذہنی جمود

طاری ہوگیا...... اس کے اسباب چند تاریخی واقعات ہیں....... اسلامی عقائد و تعلیمات کسی صورت میں اس سیاسی زوال و معاشرتی پستی کے ذمہ دار نہیں"۔

ایمان مرکزی سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور کا آرگن۔ "سیرت کمیٹی کی آخری غرض یہ ہے کہ تمام دنیا کی قوموں اور زبانوں میں حضور کے حالات کی اشاعت کی جائے" سیرت کمیٹی کی کارگذاریاں نہایت اہم اور شاندار ہیں۔ قاضی عبدالمجید صاحب قریشی سکرٹری سیرت کمیٹی کا یہ بیان ہے کہ کمیٹی نے اپنا تمام کام چندہ لینے کی بجائے اخبار ایمان اور کتب سیرت کی آمدنی سے انجام دئے ہیں اور اس آمدنی میں سے دس ہزار روپیہ نقد فقط تبلیغ اسلام کے لئے وقف کیا ہے۔

قادیانی قول فصل | مولفہ جناب سلاح الدین محمد الیاس برنی صاحب ایم۔اے۔ ایل ایل۔ بی۔ الیاس برنی صاحب کی مشہور تالیف "قادیانی مذہب" کے جواب میں "بشارت احمد" ایک کتاب شائع ہوئی تھی اس کی تنقیح کے سلسلہ میں یہ کتاب تالیف کی گئی ہے۔

قواعد عربی (حصہ اول) | از مولوی حکیم محمد ہبۃ اللہ صاحب لکچرار عربی گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد دکن یہ کتاب حیدرآباد کی جماعت ہائے پنجم و ششم کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں انگریزی خواں طلبہ کی آسانی و سہولت کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ طلبہ کو عربی گریمر سے بجائے دحشت کے انس پیدا ہو۔

تفسیر سورۂ والتین | تالیف جناب مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ ترجمہ جناب امین احسن صاحب اصلاحی۔

اسلامی ڈائری | قریشی بک ہاؤس ایجوکیشنل بک سیلر اور پبلشر گورو بازار امرت سر نے اسے شایع کیا ہے۔ "اس میں حضور سرور کائنات کی پاکیزہ سوانح حیات خلفائے راشدین، ائمہ اربعہ، مجاہدین اسلام کے حالات زندگی موجودہ اسلامی سلطنتوں کے حالات اور دنیائے اسلام کی آبادی بلحاظ ملک و ملت کے علاوہ اتحاد اسلامی اور اصلاح ملک کے لئے مضامین درج کئے گئے ہیں"۔

۲۔ سیاسی کتابیں

مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل | از میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) مدیر ہمایوں لاہور۔ یہ میاں صاحب کی وہ تقریر ہے جس کا بیشتر حصہ انجمن حمایت اسلام کی طلائی جوبلی کی تقریب پر پڑھا گیا تھا۔ بہت عالمانہ تقریر ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اس کے اندر بہت کچھ پیام امید اور درس عمل موجود ہے۔

مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ | از جناب عبدالوحید خاں صاحب بی۔اے۔ اس کتاب میں ہندوستان کی اسلامی سیاست کی مفصل تاریخ "مسلم لیگ" کے نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھ کر پیش کی گئی ہے۔ ہندوستان کی سیاسیات حاضرہ کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

انتخاب جداگانہ کا تاریخی خلاصہ | مرتبہ محمد امین صاحب زبیری اس رسالہ میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۶ء تک ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کو ان مسلمان نوجوانوں کے لئے مرتب کیا گیا ہے جن کی آرا و افکار کا رجحان ایسی سیاست کی طرف ہو جاتا ہے جو بظاہر نہایت خوش آیند اور دلپذیر ہوتی ہے لیکن اس میں مسلمان قومیت کا پہلو نہیں ہوتا۔"

مسلمانان ہند کی سیاست وطنی | مرتبہ جناب محمد امین صاحب زبیری۔ اس کتاب میں رسالہ "انتخاب جداگانہ کا تاریخی خلاصہ" کو زیادہ تفصیل کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے اور مسلمانان ہند کی اسّی سال کی سیاسی تاریخ کو مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

گفتگوئے مصالحت | اس رسالہ میں اختر بک ڈپو بمبئی نے اس خط و کتابت کو شائع کیا ہے جو مسٹر محمد علی جناح نے پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں جاری رکھی تھی۔ رسالہ کے آخر میں مسلمانان ہند کے چودہ مطالبات اور ان کی تاریخ بھی ضمیمہ کے طور پر درج کر دی گئی ہے۔

متحدہ قومیت اور اسلام | از مولانا سید حسین احمد صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیوبند قومیت اور وطنیت کے سلسلہ میں مولانائے موصوف اور علامہ اقبال مرحوم کے درمیان جو بحث چھڑی تھی یہ رسالہ اسی بحث کی ایک کڑی ہے۔ اس رسالہ کے بارے میں مولانا کا ارشاد ہے کہ اکثر مقامات پر ابحاث کو کلیات کی صورت میں پیش

لیا گیا ہے۔ مگر دراصل ان کا تعلق جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم کے مفصل بیان اور جناب مدیر احسان کی تحریر سے ہے"۔

۳۔ دیوان اور نظموں کے انتخابات

ریاض رضوان | یہ جناب ریاض خیرآبادی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۲۰۲ صفحات پر مشتمل ہے اور حضرت ریاض کی غزلیات اور دیگر اصناف سخن کا ایک جامع مجموعہ ہے۔ اس میں ملک کے ممتاز لوگوں کی تقریظ، پیش لفظ، تقریب، مقدمہ اور اعتراف اور آخر میں ضمیمہ بھی شامل ہیں۔

۱۔ اشعار میر
۲۔ اشعار ذوق | از جناب عبدالمنان صاحب بیدل ایم۔ اے عظیم آبادی پروفیسر گورنمنٹ کالج پٹنہ۔ ان دو کتابوں میں میر اور ذوق کے منتخب کلام کو پیش کیا گیا ہے۔ دونوں کے لئے بیدل صاحب نے نہایت جامع مقدمہ تصنیف فرمایا ہے۔ "اشعار میر" میں ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب صدر شعبہ عربی و فارسی و اردو کا تعارف" بھی شامل کیا گیا ہے۔

دیوان بیدر | مرتبہ جناب محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی۔ یہ مدراس یونیورسٹی اسلامیک سیریز کی دوسری کتاب ہے اور اس میں شاہ میر محمدی صاحب بیدر کے دیوان کو ڈیڑھ پونے دوسو برس کے گمنامی کے بعد ملک سے دوبارہ روشناس کرایا گیا ہے۔ دیوان کے ساتھ محوی صاحب کا مقدمہ بھی شامل ہے۔

نذر ولی | از طالبات جامعہ عثمانیہ اس میں اردو کے مشہور شاعر ولی اورنگ آبادی کے بارے میں جماعت ایم۔ اے کی طالبات کے مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔

"گریہ و تبسم" | یہ صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کے کلام کا مجموعہ ہے اور "ادارہ ادبیات اردو" جامعہ عثمانیہ کے سلسلہ مطبوعات کی پندرھویں کڑی ہے۔

۱۔ ماہر القادری کے سو شعر
۲۔ آہ کے سو شعر | "آہ کے سو شعر" نہایت دیدہ زیب طریقہ پر شائع کئے گئے ہیں۔ ماہر صاحب کے شعروں کا انتخاب بھی خوب کیا گیا ہے۔

۴۔ افسانے

فاؤسٹ | مترجمہ جناب شاہد احمد صاحب بی۔اے آنرز دہلوی۔ یہ میٹیر پرسٹن اور سنری کاسے درج کی ایک کہانی کا ترجمہ ہے

سعیِ ناکام | از ا۔ م۔ یہ ایک کم عمر مؤلفہ عزیزہ امتہ الرفیق کے ترجمہ کئے ہوئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ہینز اینڈرسن کے ان چند افسانوں کا ترجمہ کیا گیا ہے جو بچوں کے لئے خاص طور پر دلچسپ ہیں۔

شہزادہ زرتاش | از جناب سید حمید علی صاحب۔ یہ ایک دلچسپ افسانہ ہے جسے دارالاشاعت پنجاب لاہور نے شائع کیا ہے۔

بالشتیوں کی دنیا | از جناب سید فخرالدین صاحب رکن ادارہ "ہند"۔ یہ انگریزی زبان کی مشہور کتاب "گلیورس ٹریول" کا ترجمہ ہے۔

۵۔ متفرق کتابیں

مکاتیب مہدی | مرتبہ جناب مہدی بیگم صاحبہ۔ یہ اردو زبان کے بلند پایہ انشاپرداز ایم۔ مہدی حسن مرحوم کے خطوط کا مجموعہ ہے اس کتاب کے لئے مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔

مخزنِ اخلاق | از مولانا رحمت اللہ صاحب سبحانی۔ اس کتاب میں ساڑھے پانچ ہزار ادبی واخلاقی اقوال و اسباق" کو جمع کیا گیا ہے۔

تحریکِ ترقیِ مملکتِ آصفیہ | از جناب خواجہ حمید احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) جشن سیمیں مبارک کی تقریب کے سلسلہ میں نواب سہراب نواز جنگ انجہانی کے ورثا نے حیدرآباد کی ہمہ جہتی فلاح وبہبود کی تدابیر کے عنوان پر مضمون لکھنے کے لئے پانچ سو روپیہ کا انعام مقرر کیا تھا۔ خواجہ حمید صاحب کے مضمون کو اس انعامی مقابلہ میں کامیابی ہوئی تھی اسی مضمون کو کتابی شکل میں شایع کیا گیا ہے۔

جدید اردو ادب کا بانی (سر سید احمد خاں) | از جناب محمد ابواللیث صاحب صدیقی البدایونی۔ بی۔ اے۔ آنرز (علیگ) اس رسالہ میں سر سید کی تصنیفی زندگی کے مختلف مدارج کو پیش کیا گیا ہے۔

طب قدیم اور طب جدید | از جناب حکیم محمد اسماعیل صاحب اس میں طب یونانی اور طب ڈاکٹری کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

ہٹلر اعظم | از پروفیسر چندر شیکھر شاستری۔ سیاسی لٹریچر کمپنی دہلی نے اس کتاب کو شایع کیا ہے۔ اس میں نہایت تفصیل کے ساتھ جرمنی کے زمانہ قدیم سے اواخر ۱۹۳۸ء تک کی تاریخ اور جرمنی کی موجودہ سیاسی حالات درج ہیں آخر میں ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۸ء تک کے اہم واقعات ڈائری کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ جرمن الفاظ کے صحیح تلفظ کے لئے بھی ایک گلاسری درج کر دی گئی ہے۔

بھگت سنگھ | از جناب دیا کشن گنجور صاحب۔ اس میں سردار بھگت سنگھ کی زندگی کے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ آچاریہ نریندر دیو ایم۔ ایل۔ اے۔ نے اس کا مقدمہ لکھا ہے۔

ہندوستان کی اقتصادی تاریخ | از خواجہ عبدالمجید صاحب۔ اس مختصر کتاب میں ہندوستان کی اقتصادی تاریخ بیان......... کی گئی ہے۔ فہرست مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔ تمہید سیاست مدن زراعت پیشہ ملک، ہندو عہد کے اقتصادیات، اور مسلمانوں کی حملہ آوری، بحری تجارت کا حال اور مقامات ردم کی تجارت، عربوں کی بحری تجارت، مسلمانوں کے زمانہ کی تجارت، سکہ اور تبادلہ، یورپین قوموں کا ابتدائی دور ۱۹۵۶ء (؟؟) کے بعد کی تجارت، حکومت کا تجارت کے ساتھ طرز عمل، تجارت اور توازن (؟) ان عنوانات پر نہایت سرسری بحث کی گئی ہے۔ زبان اچھی ہے۔

تعلیم بالغان | از ایس۔ ایم۔ شاہ ولی بیبی بی۔ اے آنرز ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول لکھنؤ۔ یہ بالغوں کو تعلیم دینے کا نیا قاعدہ ہے۔ جس کا تجربہ بہت سے لوگوں پر مختلف جگہوں پر کیا جا چکا ہے اور مصنف کا دعویٰ ہے کہ نہایت کامیاب ثابت ہوا اس کے ذریعہ سے دو مہینے کے عرصے میں بالغ اردو پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔ اس کے تیار کرنے میں مصنف کے قول کے مطابق بالغوں کی نفسیات کو خاص طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب | از آغا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے ڈون اسکول دہرہ دون۔ یہ ایک کہانی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک ڈاکٹر صاحب نے کس طرح عزت نگر میں بالغوں کے لئے اسکول کھولا اور آہستہ آہستہ سارے گاؤں کی کایا پلٹ دی۔ صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب سابق پرنسپل کتاب کی تقریب کے سلسلہ میں لکھتے ہیں آغا محمد اشرف اپنی زبان کی سلاست لہجہ کی شیرینی، بے ساختہ پن، ظرافت اور چلتے وقت تمام ہندوستانی

کے سننے والوں سے "آداب عرض" کہنے کی وجہ سے بے حد ہر دل عزیز تھے صاحبزادہ صاحب کے اس بیان سے ہم بھی متفق ہیں۔ آغا صاحب کی تصنیف کی ہوئی کتاب سے ان کی ریڈیو کی خصوصیات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی نے اس مختصر کتابچہ کو شایع کیا ہے۔

دیومالا از سید ابن حسن صاحب جارچوی ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ یہ سلسلہ تعلیم بالغاں کی کتاب نمبر ۲ ہے جسے حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" اردو بازار دہلی نے شایع کیا ہے۔ اس میں دیوؤں کے قصے بیان کئے گئے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ زبان بھی بہت اچھی ہے۔

کسان رت مصنفہ سید مطلبی سید فرید آبادی۔ یہ ایک منظوم "ڈراما یا سانگ" ہے۔ اور غالباً دہلی کے آس پاس کے دیہاتوں میں سانگ لکھنے کا جو طریقہ رائج ہے اسی کے انداز میں اسے لکھا گیا ہے۔ سید مطلبی صاحب شمالی ہندوستان کی دیہاتی شاعری کے بارے میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لئے جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کے بارے میں بجا طور پر یہ توقع قائم کی جا سکتی ہے کہ شمالی ہندوستان کے "عوام" تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جاننے والے یا بالکل ان پڑھ" لوگوں کے لئے اس میں ضرور بہت زیادہ دلچسپی کا سامان ہوگا لیکن جن لوگوں کے ذوق خواص اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ادب تیار کرنے کی وجہ سے بگڑ گئے ہیں ان کے لئے یہ کتاب شاید زیادہ دلچسپی کا باعث نہ ہوگی۔

نوجوان اور مفلسی فلسفہ جدید از سید صابر حسین صاحب جعفری ایم۔ اے ایل ایل بی مرشد آباد ہاؤس۔ گولہ گنج۔ لکھنؤ۔ اس دلچسپ کتاب کا "ڈیڈیکیشن" "مایوس آرزوؤں کے نام" کیا گیا ہے۔ "اظہار" سے کتاب کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد "تعارف" ہے۔ اور پھر ۲۴ جون ۱۹۲۷ء سے ۲ مئی ۱۹۳۰ء تک کی ڈائری ہے۔ اس کتاب کا مبحث "تعلیم یافتہ نوجوان کی سخت زندگی اس کے تلخ تجربات اس کے جذبات اور احساسات کا سفاکانہ خون ہے۔" "ادائگی مطلب کے لئے صاف زبان استعمال کی گئی ہے جو عوام الناس کی روزمرہ بول چال سے بیشتر مشابہت رکھتی ہے۔"

یہاں ناموزوں نہ ہوگا اگر "اظہار" کی عبارت کو بجنسہ نقل کر دیا جائے :۔

"نوجوانی اور مفلسی ان کا جمع ہونا ایک نئے فلسفہ کی تخلیق کا سبب ہوتا ہے جوانی کی ابلتی ہوئی

خواہشیں اور مفلسی کی تاریک مایوسی جب ہم آغوش ہوتی ہیں تو نقاب پوش حقیقت بھر بھرانے سی ہے اور زندگی اپنے فطری انداز میں رقص کرتی نظر آتی ہے۔

"نوجوان کا ابلتا ہوا شباب، پر ارمان سینہ، بڑھتے ہوئے قدم، مفلسی کی سردی، بدبو اور بدبختی۔ لڑکھڑاہٹ، نقاہت اور مایوسی میں تبدیل نہیں کر سکتیں بلکہ اس کے گرد ایک رومانی ماحول پیدا کر دیتی ہیں جس میں خودی پر وقار انداز میں بڑھتی اور پھیلتی ہے۔

"تہذیب اور تمدن کی بڑھتی دنیا میں افسردہ تمنائیں، مایوس آرزوئیں "مایوس سکون" کی متلاشی نہیں ہوتیں بلکہ جرأت سے اپنے ماحول کو اپنی سخت اور کھردری کاوشوں سے اپنے مطابق بدلنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

کیا اچھا ہو کہ اس کتاب کو سمجھ دار اور سوچنے کے عادی دماغ ہی پڑھیں۔"

یفہ عشق | از علامہ اخلاق دہلوی، ایچ، یو، کے، پی، اے، یو" ادبی سوسائٹی نئی دہلی ملتانی ڈھانڈا۔ ا رسالے میں عشق کے رموز و اسرار کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بال کی شاعری | مرتبہ جناب عبدالمالک صاحب آروی۔ یہ وہ مقالہ ہے جو یوم اقبال کی تقریب ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو شاہ آباد اردو لائبریری کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔

یہ اقبال | از جناب اسد ملتانی صاحب۔ مرثیہ کے چند شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

وہ شعر و فلسفہ کا بحر بیکراں اقبال — جنون عشق و محبت کا راز داں اقبال
وہ فلسفے میں خودی کا پیامبر اقبال — وہ شاعروں میں حقیقت کا ترجماں اقبال
وہ جسم قوم میں مثل دماغ و دیدہ و دل — وہ روح فطرت اسلام کی زباں اقبال
یہ مانتا ہی نہیں دل کہ پا گیا ہے وفات — ________
نہیں نہیں، کبھی اقبال مر نہیں سکتا — ________

اگرچہ آج جہاں سے گذر گیا اقبال
جو کام کرنے کو آیا تھا کر گیا اقبال

۶۔ رسالے

ادب لطیف سالنامہ | نہایت پاکیزہ ادبی مضامین کا دیدہ زیب اور دلنواز مجموعہ، چودھری برکت علی بی اے اور میرزا ادیب بی اے کی ادارت میں مکتبہ اردو لاہور سے شایع ہوا ہے۔

رہنمائے تعلیم لاہور تپ دق نمبر | تپ دق کے بارے میں اس نمبر میں نہایت مفید معلومات کو جمع کیا گیا ہے۔

ایشیا | یہ سہ ماہی رسالہ جناب ساغر نظامی صاحب کی ادارت میں ادبی مرکز میرٹھ سے نہایت آب و تاب کے ساتھ شایع ہوتا ہے۔ ہندوستانی ادب، مشرقی تہذیب اور مشرق کی انقلابی روح کا علمبردار ہے۔

سب رس (دکن نمبر) | ادارہ ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ کا ماہنامہ جس کے اس نمبر کو دکن کے ماضی و حال کے متعلق دلچسپ اور اہم تاریخی معلومات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔

مکتبہ جامعہ دہلی

اردو کا قاعدہ:۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر صاحبزادہ سعید الظفر صاحب کسی لفظ کے بولنے میں جن حرفوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان سے شکل بنانا، ملانا اور ان کی مدد سے لکھنا پڑھنا بالغوں کو سکھایا جاتا ہے۔ اسی اصول پر حساب بھی بتایا گیا ہے۔ اس قاعدے کے تین حصے ہیں انھیں پڑھنے کے بعد ہر شخص آسان جملے لکھ اور پڑھ لیتا ہے۔ اس کے پڑھانے کے لیے الگ ایک کتاب "مدرس کا قاعدہ نما" لکھا ہے۔ اسے ماہرین تعلیم نے بہت پسند کیا ہے۔

قیمت حصہ اول ۱۰/

" " دوم ۱/

" " سوم ۱/

مدرس کا قاعدہ نما ۲/

اردو سکھانے کا آسان طریقہ ۴/

سائنٹفک ایڈورٹائیزنگ:۔ مصنفہ پروفیسر برہمانند گپتا۔ اس کتاب میں ایڈورٹائزنگ کی سائنس، سائی کالوجی اور فلاسفی، اشتہار بنانے کے اصول، قاعدے اور طریقے نیز اشتہاری مہم جاری کرنے کے ڈھنگ اور اس کو کامیاب بنانے کے راز بیان کئے گئے ہیں۔

آسیب الفت:۔ از سید سجاد حیدر یلدرم۔ اس میں عشق و محبت کے عنصر کو آسیب اور مردوں کی روحوں کے تخیل سے ملایا گیا ہے۔ قیمت ۱۲/

اخلاق کی کتابیں:۔ مرتبہ علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ۔ اس کے چار حصے ہیں۔ اس میں بیگم مرحومہ نے بچوں کو اخلاقی تعلیم دینے کے لئے خالص مذہبی نقطۂ نظر سے اسباق لکھے ہیں۔ جگہ جگہ قرآن و حدیث کی آیتیں بھی پیش کی گئی ہیں مثال کے لئے مسلمانوں کے صحیح اور تاریخی واقعات لکھے ہیں۔

اخلاق کی پہلی کتاب قیمت ۸/

" " دوسری کتاب " ۱۲/

" " تیسری کتاب " ۱۲/

" " چوتھی کتاب " ۱۲/

الانسان: ـ مصنفہ پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی۔ اس کتاب میں حیات جسمانی، انسان کے متعلق تحقیقات علمی، حواس، قوت نطق، حیات نفسیہ، قوت نفسانی، علم اخلاق، مذہب اور معاشرت و تمدن پر مفصل بحث ہے۔ قیمت عہ

الفہرست: ـ مرتبہ پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی۔ یہ ان تمام کتابوں کی مرتب فہرست ہے جو سنہ ۱۹۲۳ء تک تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں۔ اس سے آپ معلوم کر سکیں گے کہ ہر فن میں کس قدر کتابیں کس کس پایہ کی موجود ہیں۔ قیمت مجلد عـ

الاستدلال: ـ پروفیسر سجاد مرزا بیگ۔ اس میں فلسفے کی الجھی ہوئی گتھیاں اور منطق کے پیچیدہ اصول سلیس زبان اور سہل طریقے سے حل کئے گئے ہیں۔ قیمت مجلد سے

اتالیق بیوی: ـ مصنفہ چودھری محمد علی صاحب۔ اس میں شوہروں پر عورتوں کی بے معنی نکتہ چینیوں اور بے جا شکایتوں کا بہت ہی سچا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

ایک معمولی سی عورت: ـ انگلستان کے مشہور مصنف آسکر وائلڈ کا ایک ڈرامہ۔ ترجمہ از صغیر احمد صاحب ایم اے۔ لکچرر کمرشل کالج دہلی۔ قیمت عہ

ان پورنا کا مندر: ـ شریمتی نروپما دیوی لکاری کے مشہور بنگالی ناول کا ترجمہ۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے۔ قیمت عہ

آسان کاروبار: ـ اس مختصر سی کتاب میں ۱۰۸ ایسی ترکیبیں درج ہیں جن میں سے ایک میں انسان کامیابی حاصل کرکے اپنی زندگی کامیاب بنا سکتا ہے۔ قیمت ۸ر

ازواج الانبیا: ـ اس میں نبیوں کی بیویوں کے حالات درج ہیں۔ اس سے اخلاق، ایمان، فرمانبرداری اور جبر و تشدد کے خلاف مقابلہ کا اچھا سبق ملتا ہے۔ قیمت عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

ایجنسی کی کتابیں

الصالحات: ۔ اس مختصر سی کتاب میں مشاہیر مسلمان و ہندو خواتین کی تاریخی حکایتیں درج کی ہیں جو سبق آموز واقعات زندگی پر مشتمل ہیں۔ یہ خواتین کی اعلیٰ اخلاقی تعلیم کے لئے شمع ہدایت ہے۔ قیمت ۸/

افضال رحمانی: ۔ مولفہ سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کلمہ طیبہ، قرآن مجید، بسم اللہ، سورہ فاتحہ اور درود شریف کے فضائل و برکات کا بہترین مجموعہ۔ قیمت ۷/

ایوانِ تمدن: ۔ مصنفہ ڈاکٹر مرزا ریاض احمد بیگ چغتائی، تہذیب حاضرہ کی صحیح صحیح تصویر عجیب دلکش پیرایہ میں پیش کی گئی ہے۔ سیرت نگاری کے اصول پر اپنے قسم کی بہترین تصنیف ہے۔ قیمت عہ/

آسمانی دودھا: ۔ پروفیسر میر تجمل حسین نے آفتاب، ماہتاب، سیارے، ستارے اور آسمان پر جگمگ جگمگ کرنے والی مخلوق کے مکمل اور دلچسپ حالات بچوں کے لئے لکھے ہیں۔ قیمت ۱۲/

آسان قاعدہ: ۔ اس کا ہر سبق ایک خاص قاعدہ کے ماتحت ہے۔ حروف کے نام کے بجائے آوازیں سکھائی گئی ہیں۔ دوسرے میں ایسے اسباق دئے گئے ہیں جن میں تمام حروف پورے پورے اور الگ الگ دکھائے جاتے ہیں اور اسی قسم کی بہت سی باتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ قاعدہ مرتب کیا ہے۔ قیمت ۲/

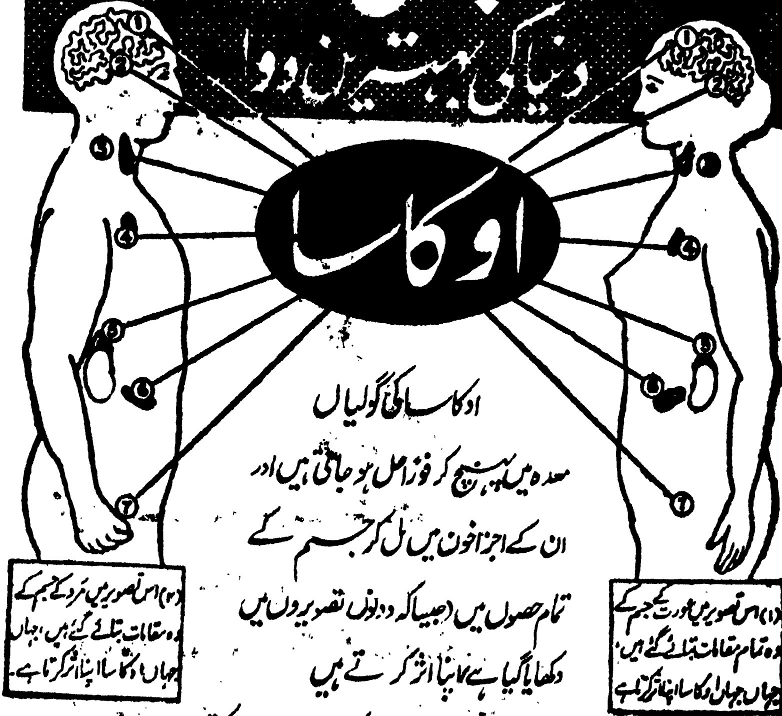
آسان کتاب: ۔ یہ کتاب سلسلہ نصاب ہندستانی کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں مطالعہ قدرت، حفظانِ صحت، مکالمات، حکایات، اور بچوں کے ماحول کی دوسری چیزیں بہت دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہیں۔ قیمت ۲/

ارجن: ۔ از پروفیسر رام سروپ کوشل۔ اس میں ارجن کی زندگی کے حالات بہت مفصل لکھے ہیں۔ ان کی بہادری کا حال جنگ مہابھارت سے معلوم ہوتا ہے۔ قیمت ۲/

آموزگار پارسی: ۔ مصنفہ آزاد۔ اس مختصر سے رسالہ میں جدید فارسی سیکھنے کی تمام ضروریات کے نام، ان کے فعل اور موقع و محلِ استعمال اس طرح بار بار دکھائے گئے ہیں کہ اگر طالب علم غور سے پڑھے تو پھر بول چال کے متعلق کسی اور دوسری کتاب کا محتاج نہ رہے۔ قیمت ۱۲/

مکتبہ جامعہ دہلی

طاقت اور جوانی قائم رکھنے کیلئے
دنیا کی بہترین دوا



اوکاسا دل ودماغ، گردوں، معدہ اور ہاضمہ میں سے ہر ایک پر پورا پورا اثر کرتا ہے۔

اوکاسا کا اصلی اثر غدود (نمبر ۲) پر ہوتا ہے۔ اس سے تمام جسمانی طاقت اور قوت مردانگی از سر نو پیدا ہونے لگتی ہے عورتوں پر بھی یہی اثر ہوتا ہے جس سے ان کا بانجھ پن اور عام کمزوری اور حیض کا نہ آنا اور اس قسم کی تمام شکایتیں دور ہو جاتی ہیں۔

اوکاسا اشتعال انگیز یا گرمی پیدا کرنے والی دوا نہیں ہے۔

اوکاسا ایسے اجزا سے بنی ہوئی ہے جو آپ کے جسم میں موجود ہیں اس لئے آپ ہر موسم میں استعمال کر سکتے ہیں۔

مردانہ طاقت بحال کرنے کے لئے آج ہی سے اوکاسا شروع کر دیجئے

خرید کرتے وقت مردوں کے لئے اوکاسا (سلور) اور عورتوں کے لئے اوکاسا (گولڈ) طلب کیجئے۔

قیمت چھوٹا بکس ۱۲/ بڑا بکس عـہ / اوکاسا ہر دوا فروش کے یہاں ملتا ہے۔

پارک منشن، دہلی گیٹ دہلی یا براہ راست اوکاسا کمپنی (برلن) لمیٹڈ پوسٹ بکس ۲۹۶ بمبئی

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں انقلاب پیدا کرنے کی اردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم
دہلی

زیر ادارت: شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے۔

اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے۔ اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بہ تازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے۔

عمدہ تصاویر سے مزین۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق۔

سالانہ چندہ چھ روپے (للعہ) ششماہی تین روپے آٹھ آنے

نمونہ کے پرچہ کے لئے ۹/ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

مینیجر "کلیم" ۵ جانتی نواس دریا گنج دہلی

مطبوعات انجمن ترقی اردو ہند

نام کتاب	مجلد	غیر مجلد	نام کتاب	مجلد	غیر مجلد
فلسفۂ تعلیم	عا ر	۱۲ آر	تاریخ اخلاق یورپ حصہ اول	سے ر	عہ ر
القول الاظہر	عہ ر	۸ ر	״ ״ ״ دوم	عہ ر	عا ر
رہنمایان ہند	عا ر	عہ ر	تاریخ یونان قدیم	عا ر	•
امرائے ہنود	عہ ر	سے ر	نکات الشعرا	عہ ر	۱۲ آر
القمر	عہ ر	•	وضع اصطلاحات	۱۲ آر	۸ آر
تاریخ تمدن حصہ اول	عا ر	عہ ر	بجلی کے کرشمے	۱۲ آر	۸ آر
״ ״ دوم	عا ر	عہ ر	تاریخ ملل قدیمہ	۱۲ آر	•
فلسفۂ جذبات	عہ ر	عا ر	محاسن کلام غالب	عہ ر	۱۰ ر
البیرونی	عا ر	عہ ر	قواعد اردو	عہ ر	عا ر
دریائے لطافت	سے ر	عہ ر	تذکرہ شعرائے اردو	۱۲ آر	۸ آر
طبقات الارض	عہ ر	عا ر	جاپان اور اسکا تعلیمی نظم و نسق	سے ر	عہ ر
مشاہیر یونان و رومہ حصہ اول	للعہ ر	سے ر	تاریخ ہند ہاشمی	•	۱ آر
״ ״ ״ دوم	سے ر	عہ ر	مثنوی خواب و خیال	عہ ر	عہ ر
اسباق النحو حصہ اول	•	۶ ر	کلیات ولی	صہ ر	للعہ
״ ״ دوم	•	۶ ر	چمنستان شعرا	صہ ر	للعہ ر
علم المعیشت	صہ ر	صہ ر	ذکر میر	•	عا ر

المشتہر: مظفر حسین شمیم انجمن ترقی اردو (ہند) القریش نئی دہلی

جدید مطبوعات جامعہ

مضامین محمد علی - مرتبہ محمد سرور صاحب پروفیسر جامعہ - یہ اس دور کی تاریخ ہے جب ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور برسوں کے خوابیدہ مسلمان اٹھے۔ قیمت مجلد عمر

دنیا کی کہانی - از پروفیسر محمد مجیب صاحب - اس مختصر سی کتاب میں ہزاروں برس کی تاریخ اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والا بادشاہوں کی لڑائی اور تاریخوں کے گورکھ دھندے میں پڑے بغیر وہ سب سمجھ جاتا ہے جو تاریخ کا اصل مفہوم ہے۔ قیمت عا؍

شہری آزادی - از ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب - یہ ایک کتابچہ ہے جس میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور ان کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کس طرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو ان کے ان حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جس سے ان کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۶؍

ہندوستان میں برطانوی حکومت - از ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب - یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لوٹا جا رہا ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے یہ کتاب پڑھئے جس میں برطانوی سامراج کی اقتصادی اور مالی پالیسی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۸؍

ہندوستان میں دیہی قرض - مصنفہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے - اس چھوٹی سی کتاب میں قرض کے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کسان کی کیا حالت ہے اور ایک گاؤں کی مفصل تحقیقات پیش کی گئی ہے۔ قیمت ۴؍

مکتبہ جامعہ

دہلی - نئی دہلی - لاہور - لکھنؤ

بلاغ امرتسر

اپنے معاصرین کی نظر میں

۱۔ بلاغ میں محققانہ مضامین شائع ہوتے ہیں (ایمان)

۲۔ قرآنی حقائق و معارف کی اشاعت اور صرف کلام اللہ کے جامع و مکمل اصول کی طرف فرزندان توحید کو مائل کرنا بلاغ کے مقاصد خصوصی ہیں (ترجمان سرحد)

۳۔ رسالہ اپنے موضوع میں بہت اچھا ہے اور متانت و سنجیدگی کا جو اعلیٰ معیار اس میں قائم رکھا گیا ہے، وہ یقیناً قابل تحسین ہے۔ (الجمعیۃ)

۴۔ وہ لوگ جو قرآنی علوم کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہونا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی علوم اسلامی کو سمجھنے اور ان میں تمیز کرنے کے اہل ہیں، ان کے لئے اس رسالہ کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ (دور جدید)

۵۔ ہر ایک مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قرآن شریف کی روزانہ تلاوت کرنے والوں کے واسطے، رسالہ بلاغ واقعی سچی رہنمائی کرے گا (کراچی نیوز)

۶۔ تمام کا تمام رسالہ قرآن کی تعلیم اور مذہبی احکام کا دلچسپ اور بہترین آرگن ہے (سالار)

۷۔ یہ رسالہ عرصہ سے قرآنی حقائق و معارف کی تشریح و اشاعت کا فرض نہایت عمدگی سے انجام دے رہا ہے۔ (سالک)

لکھائی، چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ، قیمت سالانہ تین روپے۔ نمونہ کا پرچہ چار آنہ کے ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

مکتبہ جامعہ کو حال ہی میں بہت سی ایسی کتابوں کی سول ایجنسی حاصل ہوگئی ہے جو اب تک دوسرے ناشروں کے یہاں سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مطبوعات جامعہ عثمانیہ بھی شامل ہیں جو ہمیں تمام شمالی ہندوستان کے لئے سول ایجنسی پر ملی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی کتابیں اب تک ایک خاص حلقے تک محدود تھیں اور ان کی قیمتیں بھی اتنی زیادہ تھیں کہ عام شائقین بہ مشکل خرید سکتے تھے۔

امید ہے کہ ارباب ذوق اور تاجران کتب ہم سے یا ہماری شاخ مکتبہ جامعہ ریلوے روڈ لاہور سے مکمل فہرست طلب فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی - لاہور - لکھنو

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع برقی پریس دہلی